ماہنامہ محدث بنارس

سرپرست
عبداللہ سعود بن عبدالوحید

مدیر
مولانا عبدالوہاب حجازی

معاون مدیر
مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی — مولانا عبدالمتین مدنی

عدد مسلسل: ۳۱۹
جلد: ۲۸ ، شمارہ: ۷
رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
جولائی ۲۰۱۰ء

بدل اشتراک
- ہندوستان: 150 روپے
- بیرون ممالک: 40 ڈالر
- فی شمارہ: 15 روپے

مراسلت کا پتہ
دار التالیف والترجمہ
بی ۱۸/۱ جی، ریوڑی تالاب
وارانسی - ۲۲۱۰۱۰
Darut Taleef Wat Tarjama
B.18/1-G, Reori Talab,
Varanasi - 221010

اس شمارہ میں

۱-درس قرآن	عبداللہ سعود بن عبدالوحید	۲
۲-درس حدیث	مولانا عبدالسلام مدنی	۳
۳-افتتاحیہ	مدیر	۴
۴-روزے کے دنیوی واخروی...	مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ	۶
۵-خلیفۂ اول صدیق اکبرؓ...	مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی	۱۲
۶-بلوغ المرام اور اس کا منہج تدریس	مولانا عبدالمتین مدنی	۱۸
۷- تیمّم کے احکام ومسائل.....	عبدالولی عبدالقوی	۲۳
۸-بہ یاد استاذ محترم ڈاکٹر مقتدی حسن..	عبدالسمیع محمد ہارون سلفی	۲۷
۹-شہادت حسینؓ ایک تحقیقی جائزہ	عبدالغفار سلفی	۲۹
۱۰-موت سے متعلق پانچ سوالات	ابوالبیان رفعت سلفی	۳۴
۱۱-حصول علم دین کا مقصد اور طلبہ	محمد فرقان معین الحق سلفی	۴۳
۱۲-عالم اسلام	ظل الرحمٰن سلفی	۴۵
۱۳-اخبار جامعہ وجماعت	ادارہ	۴۶
۱۴-باب الفتاوی	مولانا نور الہدی سلفی	۴۷

نوٹ : ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

درس قرآن

اللہ سے محبت سب کے اوپر ہے، یہی بندگی کا تقاضا ہے

عبداللہ سعود بن عبدالوحید

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللّهِ أَندَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّهِ وَالَّذِينَ آمَنُواْ أَشَدُّ حُبّاً لِّلّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُواْ إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّهِ جَمِيعاً وَأَنَّ اللّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسرے کو شریک بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہئے، اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، اللہ سے محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں، کاش یہ ظالم لوگ جانتے کہ جب عذاب دیکھ لیں گے تب جانیں گے کہ (سچ مچ) تمام طاقت صرف اللہ ہی کو ہے، اور یہ (بھی) کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالی نے بتایا کہ بنی آدم ابھی یہ نہیں سمجھ پا رہا ہے کہ ہر طرح کی قدرت اور طاقت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اس کا حکم ہے جو مانگنا ہے اللہ سے مانگو اور عبادت و بندگی کے لائق صرف اسی کی ذات ہے، اس کے علاوہ دنیا میں بلکہ کائنات میں ہر مخلوق اس کے حکم کے تابع ہے، اس میں جن وانس اور ولی و نبی سب سے شامل ہیں، نہ کسی کے اندر کوئی قدرت ہے اور نہ اختیار کہ وہ اللہ کے کام میں مداخلت کر سکے، انسان کا پیدا کرنا، زمین سے غذا عطا کرنا، بادل سے بارش نازل کرنا، کسی کو آگے بڑھانا، کسی کو پیچھے کرنا، یہ سب اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، ان کاموں میں کسی انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

جو لوگ اس کو نہیں سمجھتے اور توحید کا جو تقاضا ہے اس کو نہیں بوجھتے وہ دوسروں سے بھی محبت کرتے ہیں اور اس کے آستانہ پر سر خم کرتے ہیں، بلکہ جب ان کے عقیدہ میں خرابی ہو جاتی ہے تو ان سے ایسی زیادہ محبت کرتے ہیں کہ ان کے نام کا نذر و نیاز بھی کرتے ہیں۔

اللہ تعالی نے فرمایا جو صرف اللہ کو حاجت روا و مشکل کشا سمجھتے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ کو چاہتے ہیں، اور ان کی محبت اللہ سے بہت سخت ہوتی ہے، جیسا کہ مکہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ آگ کے انگارہ پر بھی اللہ اللہ کیا کرتے تھے۔

اللہ نے فرمایا: جو لوگ شرکیہ عمل کر کے اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں، یہ ظالم لوگ جب اللہ کا عذاب اپنے سامنے دیکھیں گے تو اس وقت ان کو سمجھ میں آجائے گا کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہی تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ سے اللہ نے کہلوایا اگر تم سچ مچ اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

بندگی سے اصل مقصود اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی ہے اور اللہ کی رضا بغیر رسول اللہ ﷺ کی پیروی کئے اور ان کے حکم کو مانے نہیں مل سکتی۔

کاش مسلمان اس آیت کے مفہوم پر غور کرتے اور اپنی لو اللہ سے لگاتے، اللہ ہم کو اس کی توفیق بخشے، آمین۔ ☆

درس حدیث: ۱۳۵

احسان کا بدلہ

تحریر: مولانا عبدالسلام مدنی / استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

عن ابن عمر، قال: قال رسول الله ﷺ: من استعاذ منكم بالله فأعيذوه، ومن سأل بالله فأعطوه، ومن دعاكم فأجيبوه، ومن صنع إليكم معروفا فكافئوه، فإن لم تجدوا ما تكافئوه فادعوا له حتى تروا أن قد كافأتموه. رواه أحمد، وأبوداود، والنسائي. (مشكاة ج ١ ، ص ١٧٢)

قال في المرعاة: ..... وسكت عنه أبوداود والمنذري، وصححه الحاكم ووافقه الذهبي، وقال النووي: حديث صحيح. (مرعاة ج ٦ ، ص ٣٨٠)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو انسان تمہارے (یا غیر کے) شر وفساد سے اللہ پاک کی پناہ مانگے، تو اسکو پناہ دے دو، اور جو اللہ تعالی کا نام لیکر (کچھ) سوال کرے تو (یافت ہونے پر) اس کا سوال پورا کردو، اور جو دعوت (طعام) دے تو اس کی دعوت قبول کرو، اور جو تم پر کوئی احسان کرے تو اس کے سلوک واحسان کا پورا بدلہ دو، اگر مال نہ ہو تو اسکے لیے دعاء خیر کرتے رہو یہاں تک کہ سمجھو پورا بدلہ ہوگیا۔ (احمد، ابوداود، نسائی، حدیث صحیح)

تشریح: شریعت میں احسان کا لفظ تین معانی میں استعمال ہوا ہے، اور احسان کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿إن الله يأمر بالعدل والاحسان وإيتاء ذي القربى ..... الآية، النحل: ٩٠﴾ یعنی ''اللہ تعالی عدل کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے''۔ (جونا گڈھیؒ)

اسی آیت کریمہ کے تحت مولانا یوسف صاحب رقمطراز ہیں: ''احسان کے ایک معنی حسن سلوک، عفو ودرگذر اور معاف کردینے کے ہیں، دوسرے معنی تفضُّل کے ہیں، یعنی حق واجب سے زیادہ دینا، یا عمل واجب سے زیادہ عمل کرنا، مثلاً کسی کام کی مزدوری سو روپے طے ہے لیکن دیتے وقت ۱۰/۲۰ روپے زیادہ دے دینا، طے شدہ سو روپے کی ادائیگی حق واجب ہے اور یہ عدل ہے، مزید ۱۰/۲۰ روپے یہ احسان ہے، .....، احسان کے ایک تیسرے معنی اخلاص عمل اور حسن عبادت ہے، جس کو حدیث میں "أن تعبد الله كأنك تراه" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو)

حدیث پاک سے چند امور کا ثبوت ہوتا ہے: (۱) جب کوئی مظلوم اللہ کا واسطہ دے کر فریاد کرے تو اس کی فریاد رسی کرو، (۲) سامان ہوتے ہوئے اللہ کے نام پر مانگنے والے کی مانگ پوری کرو، (۳) دعوت طعام مانع شرعی نہ ہونے پر قبول کرو، (۴) حسن سلوک اور بھلائی کا بدلہ بھرپور دو، مال واسباب نہ ہونے پر اتنی دعاء دو کہ بدلہ پورا ہوجائے۔

حدیث کے آخری ٹکڑے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احسان کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ دعا کرنے پر پورا بدلہ ادا ہوگا، مگر دوسری حدیث شریف سے امت کے لیے ایک آسانی کا بھی ثبوت ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے: "من صنع إليه معروفا، فقال لفاعله: جَزَاك اللهُ خيرا، فقد أبلغ في الثناء. أخرجه الترمذي. یعنی اگر کوئی احسان وسلوک ہونے پر ایک بار بھی "جزاك الله خيرا" کہہ دے تو پورا بدلہ ہوجائے گا۔ (ترمذی شریف)

صاحب مرعاۃؒ فرماتے ہیں: "فدل هذا الحديث على أن من قال لأحد: جزاك الله خيرا، مرة واحدة، فقد أدى العوض وإن كان حقه كثيرا. (مرعاۃ ج۶، ص۳۸۰)

رب العالمین! پوری امت مسلمہ کو احسان وسلوک کرنے، اور بھلائیوں کا اچھا سے اچھا بدلہ دینے والا بنا، آمین۔ ☆☆

افتتاحیہ

اللہ،اللہ! نبی ہیں نبی!

بے روک ٹوک آزادی کی طلب اور دوڑ میں انسان اپنے خالق و مالک سے دور اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے مقابل خودسر اور مغرور ہوتا جارہا ہے، جس کے مظاہر روز بروز سامنے آتے جارہے ہیں، ہزاروں برس تک بنی اسرائیل نبیوں اور رسولوں کی بعثت سے سرفراز تھے، پھر ان میں دنیا پرستی آئی تو تعلیمات انبیاء کی توہین رسولوں پر زنا اور ولد الزنا ہونے کی تہمتیں لگانے اور انہیں قتل تک کرنے لگے، یہ نہایت بھیانک جرائم تھے جنہوں نے انہیں نمبر ایک دنیا پرست بنادیا تو اللہ تعالی نے آسمانی تعلیمات کی امانت خاتم الانبیاء والرسل حضرت محمد ﷺ اور ان کی امت کے حوالہ کردی، اہل کتاب کی قدیم بری عادتیں خاتم الانبیاء کے تعلق سے بھی آج کے مادہ پرست دور میں بارہا نمایاں ہورہی ہیں، آپ ﷺ کے کارٹون اور ہزلی تصویریں شائع کرکے آپ کی توہین کی جارہی ہے، جس کا علم ساری دنیا کے بنوآدم کو ہے، یہ نہایت بھیانک جرم ہے، اگر جدید دور کا انسان خاتم الانبیاء اور دیگر نبیوں کی حرمتوں اور عزتوں کی حفاظت نہ کرسکے تو یہ دنیا بے حیائیوں اور ظلم وستم کے اڈہ کے سوا اور کیا رہ جائے گی۔

اہل اسلام کی یہ مسلمہ خوبی ہے کہ وہ کسی بھی نبی کی توہین نہیں کرتے اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی توہین انہیں بدرجۂ اولی گوارا نہیں، یہ خوبی اسلام کی تعلیمات نے پیدا کی ہے، یہی وجہ ہے کہ کتابیہ عورت جب مسلمان کے گھر میں از راہ نکاح آتی ہے تو اسے جذباتی سکون میسر ہوتا ہے، لیکن مسلمان عورت اہل کتاب کے یہاں یہ جذباتی سکون نہیں پاسکتی، اس لیے کہ وہ خاتم الانبیاء کو نبی تسلیم نہیں کرتے اور ان کی توہین بھی کرتے ہیں، اس لیے مسلمہ کا عقد کتابی سے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

بعض مغربی اخباروں کی طرف سے خاتم الانبیاء کی ہزلی تصویروں کی بار بار اشاعت اور ہمارے نبی کی مسلسل توہین نیز ہمارے ملک میں بعض ججوں کی جانب سے عمل قوم لوط کے جواز کی جانب اشارہ پر گفتگو کے دوران اخبارات اور میگزینوں میں لوطی اور لواطت کے الفاظ کے بکثرت استعمال سے مجھے بے حد تکلیف ہوتی تھی اور میں سوچتا تھا کہ ایک عظیم الشان اللہ کے نبی لوط علیہ السلام کا نام ایک خبیث اور گندے عمل کے تعلق سے کس قدر سہولت سے استعمال کیا جارہا ہے اور کوئی نبی کی عظمت کی جانب دھیان دینے والا بھی نہیں ملتا، میرے دل میں اس پر جستجو اور تحقیق کا کئی بار خیال آیا، اللہ بھلا کرے دکتور عدنان خالد الدوسری کا کہ انہوں نے الفرقان شمارہ ۵۶۶ الکویت میں اس پر ایک تحقیقی تحریر شائع کی جس پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ مزید بحث کی کلفت سے بچ گیا، اس تحریر میں موصوف نے قرآن، سنت اور لغت عرب کے حوالہ سے یہ ثابت کردکھایا ہے کہ ایسے گندے عمل کے نام کا اشتقاق ایک پاکیزہ اور باعظمت نبی کے نام سے کرنا جائز نہیں ہوسکتا، انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن مجید نے اسے ''فاحشہ'' اور ''السیئات'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اللہ تعالی نے فرمایا: "ولوطا إذ قال لقومه أتاتون الفاحشة ما سبقكم بها من أحد من العالمين، انكم لتأتون الرجال شهوة من دون النساء بل أنتم قوم مسرفون" (الاعراف:۸۰،۸۱) اور ہم نے

لوط کو بھیجا، جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ایسا فحش کام کرتے جسکو تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا، تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو، عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم تو حد ہی سے گذر گئے ہو۔

اور ارشاد فرمایا:

" وجاء ه قومه يهرعون اليه ومن قبل كانوا يعملون السيئات، قال يا قوم هؤلاء بناتي هن أطهر لكم فاتقوا الله ولا تخزون في ضيفي أليس منكم رجل رشيد" (ھود:۷۸)

اور اس کی قوم دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ پہنچی، وہ تو پہلے ہی سے بدکاریوں میں مبتلا تھی، لوط علیہ السلام نے کہا اے قوم کے لوگو! یہ ہیں میری بیٹیاں جو تمہارے لیے بہت ہی پاکیزہ ہیں، اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو، کیا تم میں ایک بھی بھلا آدمی نہیں ہے۔

حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسے عمل قوم لوط کہا ہے، لوط یا لواطت کا لفظ اس کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "من وجدتموه يعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول به" (مستدرک حاکم) جسے پاؤ کہ وہ قوم لوط جیسا عمل کرتا ہو تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو۔ یہ الفاظ ابوداود، ابن ماجہ، بیہقی اور ترمذی وغیرہ کے یہاں موجود ہیں۔

لواطت کا لفظ عربی لغات میں مروجہ معنی میں نہیں بلکہ حوض کو لیپنا، اس کی اصلاح کرنا، کسی قوم سے مل جانا ہے، اور "لاط، يلوط" کے معانی سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نبی محترم حضرت لوط علیہ السلام کے نام کے معنی ہیں: دل سے چمٹنے والی محبت، اس لیے کہ انبیاء کرام کے نام نفوس کو محبوب، دلوں سے قریب معانی سے ماخوذ اور زبان پر سہل ہوتے ہیں۔

درحقیقت اس گندے فعل کے نام کا اشتقاق اللہ کے نبی لوط کے نام سے کرنے کی بنا پر لوگ اپنے بیٹوں کا نام اس نام پر رکھنے سے دور بھاگتے ہیں، قدیم وجدید ہر دور میں لوگوں نے اس سے اجتناب کیا ہے، جب کہ دیگر انبیاء کے نام بکثرت ہر دور میں عام رہے ہیں۔

دکتور عدنان حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس نام اور اصطلاح کا استعمال ایک شرعی اور لغوی غلطی ہے، اس کی اصلاح ہونی چاہئے اور ایسے خبیث اور گندے فعل کا نام ایک پاکیزہ نبی کے نام سے اخذ کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ ہماری متعدد تفسیر، فقہ واحکام اور احادیث کی کتابوں میں ائمہ اور علماء نے لوطی، لواطت اور دیگر اشتقاقات کا استعمال اسی معنی میں کیا ہے اور اس کے احکام بیان کئے ہیں مگر شرعا اور لغۃ یہ غلط اور ناجائز ہے۔

غرض یہ کہ انبیاء کی توہین بڑا مجرمانہ عمل ہے، تمام انسانوں کو ان کا احترام مدنظر رکھنا چاہئے اور ایک گندے اور خبیث عمل کا نام ایک عظیم الشان نبی کے نام سے اخذ کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے، اس لیے کہ مسلمانوں کے عظیم شعائر میں سے ہے کہ وہ تمام انبیاء کا بلا استثناء احترام کرنا ضرور سمجھتے ہیں اور کسی بھی طرح ان کی توہین سے بچتے ہیں۔ ☆☆☆

روزے کے دنیوی اوراخروی فائدے

تحریر: الشیخ عبداللہ بن زید المحمود
ترجمہ: مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ

صحیحین کی حدیث ہے:

ان النبی ﷺ قال: إذا جاء رمضان فتحت أبواب الجنة وغلقت أبواب النار وصفدت الشیاطین۔ نبیﷺ نے فرمایا جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں اور شیطانوں کومقید کردیا جاتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی، نسائی اور حاکم نے روایت کی اور اس حدیث میں ہے:'' وینادی منادیا باغی الخیر اقبل و یا باغی الشر اقصر و لله عتقاء من النار و ذلك كل ليلة ''اور ایک منادی آواز دیتا ہے کہ اے خیر کے چاہنے والے آگے بڑھ اور اے برائی کا قصد کرنے والا باز آ، اور اللہ تعالیٰ کچھ بندوں کودوزخ سے آزاد کرتا ہے ایسا ہی ہر رات ہوتا ہے۔

حاکم نے کہا کہ شرائط کے مطابق یہ صحیح حدیث ہے، ایک دوسری حدیث میں رمضان کی برکت یوں بیان کی گئی ہے:

''عن عبادة بن الصامت أن رسول الله ﷺ قال: يوما وحضر رمضان: "أتاكم رمضان شهر بركة يغشا كم الله فيه فينزل الرحمة و يحط الخطيئة ويستجيب فيه الدعاء ينظرالله إلى تنافسكم فيه فيباهي بكم ملائكة فأروا الله من أنفسكم خيرا فان الشقى من حرم فيه رحمة الله عزوجل۔''

عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ آ گیا تھا فرمایا،''رمضان کا مہینہ تمہارے لئے برکت لایا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو برکتوں سے ڈھانک دے گا۔ رحمت نازل کرے گا، اور گناہوں کو ساقط کردے گا اور دعاؤں کو قبول کرے گا، اللہ تعالیٰ رمضان میں تمہاری مقابلہ آرائی کو دیکھتا ہے وہ تمہارے ساتھ فرشتوں پر فخر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی جانب سے خیر دکھاؤ، بدبخت ہے وہ شخص جو اس مہینہ میں اللہ کی رحمت سے محروم رہے۔

یہ حدیث طبرانی نے روایت کی اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ انھیں فضائل کہ وجہ سے رمضان کی آمد کے موقعہ پر مسلمان ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں کیونکہ رمضان کی آمد ان لوگوں کے حق میں نعمت عظمیٰ ہے جو مطیع وفرمانبردار اور متقی وپرہیزگار ہوتے ہیں۔ اس مسلمان سے کوئی افضل نہیں ہے جو حالتِ اسلام میں عمر دراز پائے تاکہ آخرت سفر کے لئے نماز، صدقات، روزوں اور صالح اعمال کا زادِراہ لے لے۔ قبروں پر مردے اس بات پر حسرت کرتے ہیں کہ ان کو ایک رکعت زیادہ پڑھنے، صدقہ دینے اور ایک دن زیادہ روزہ رکھنے کا موقعہ ملے اور تمنا کرتے ہیں کہ کاش وہ پھر دنیا میں اعمال صالح

کرنے کے لئے واپس آجائیں۔مردوں میں سے ایک کوتاہ عمل کہتا ہے:''رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت''اے خداتو مجھے واپس بھیج دے تاکہ جوعمل صالح میں نے چھوڑ دیا ہے وہ کرلوں۔

ان کوکوئی جواب نہیں ملتا ہے،ان کے اورعمل صالح کے درمیان ایک دیوار حائل ہوتی ہے اوران کا حساب کتاب بند ہو چکا ہوتا ہے، وہ عمل کی تمنا کرتے ہیں،لیکن عمل کرنہیں سکتے ہیں۔اورتم لوگ عمل کر سکتے ہولیکن عمل کرتے نہیں ہو دنیا آخرت کی کھیتی ہے جس میں اعمال صالحہ کی کھیتی کی جاتی ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:﴿ ادخلوا الجنة بما کنتم تعملون﴾ جنت میں داخل ہواس کے بدلہ جوتم عمل کرتے تھے۔

جودنیا سے نیکیوں اوراعمال سے محتاجی کے عالم میں گیاوہ آخرت میں بھی محتاج اٹھے گا۔اوراس کا بُرا اٹھکانا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

غدا توفی النفس ما عملت ویحصد الزارعون ما زرعوا
ان أحسنوا أحسنوا لأنفسهم وان أساؤا فبئس ما صنعوا

لوگ کل وہی پائیں گے جوانھوں نے اعمال کئے ہوں گے،کھیتی کرنے والا وہی کاٹتا ہے جوکھیتی کرتا ہے،اگرانھوں نے اچھے اعمال کئے تواپنے لئے کئے اوراگربُرے اعمال کئے توبُرا کیا جوانھوں نے کیا)

ماہ رمضان عمل اور جدوجہد کا مہینہ ہے یہ عبادت گذاروں کے لئے کھیتی کا زمانہ ہے دلوں کوفساد سے پاک کرنے ، شہوتوں ،حرص وطمع اوربغض وعناد کے قلع قمع کرنے کا زمانہ ہے، جواس میں خیر کی کھیتی کریگا اس کا مآل کار کٹائی کے وقت بہترین ہوگا۔

اس میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اوردوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ عبادت کرتے ہیں اوراعمال صالحہ میں بھی ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہیں۔یعنی وہ نمازیں زیادہ پڑھتے ہیں اور ہاتھ صدقات کے لئے کشادہ کئے رہتے ہیں اورصلہ رحمی کرتے ہیں نیز مسکینوں،یتیموں اورمحتاجوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کرتے ہیں،دعاؤں میں کثرت کرتے ہیں،اوراستغفار کرتے ہیں اوراپنے دسترخوان پر زیادہ سے زیادہ روزہ داروں کومدعوکرتے ہیں اورظاہر بات ہے کہ یہ اعمال صالحہ کرنے والے اس بات کے سزاوار ہیں کہ ان کے لئے جنت کے دروازے واکردیئے جائیں اورجہنم کے دروازے ان پر بندکردیئے جائیں۔

رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ فیاض تھے،رمضان میں جب جبرئیل علیہ السلام ان سے ملتے تھے اوران کو قرآن کا درس دیتے تھے تو ان کی فیاضی،صدقات،حسن سلوک اورتلاوت قرآن دوسرے ایام کے مقابلہ میں دو چند ہو جاتی تھیں،اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے اپنی رحمت مخصوص کردے،ایک انسان کو دوسرے انسان پر ایک جگہ کو دوسری جگہ پر اور ایک زمانہ کودوسرے زمانہ پرفضیلت دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کوفضیلت کے لئے مخصوص کیا ہے۔چنانچہ اس میں قرآن کریم نازل فرمایا اورمومنین پراس میں روزے فرض کئے،رمضان کے ابتدائی حصہ کورحمت اس کے وسطی حصہ کومغفرت اور

آخری حصہ کو جہنم کی آگ سے نجات کا ذریعہ بنایا۔

رسول اللہ ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا کہ رمضان سے بہتر کوئی مہینہ نہیں ہے مسلمانوں کے لئے۔

رمضان میں صدقات اور اعمال صالحہ کے ثواب کا دوچند ہونا:

رمضان میں صدقہ کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے، رمضان کی عظمت کی وجہ سے سب سے افضل صدقہ رمضان کا ہے۔ترمذی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے:''عن أنس قال: سئل رسول الله ﷺ أيما الصدقه أفضل؟ قال " صدقة فی رمضان'' انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کون صدقہ افضل ہے؟ آنے فرمایا رمضان میں صدقہ دینا۔

چنانچہ اس ماہ میں سلف صالحین صدقہ کے لئے اپنے ہاتھ کشادہ کردیتے تھے اس امید سے کہ اس کا اجر دوگنا ملے گا۔ حدیث میں ہے:'' من تقرب فيه بخصلة من خصال الخير كان كمن أدى فريضة فيما سواه''اس مہینہ میں کسی اچھی عادت سے کسی شخص نے تقرب الٰہی حاصل کیا۔اس کا ثواب اس شخص کے ثواب کے برابر ہے جس نے رمضان کے علاوہ میں کوئی فرض ادا کیا۔

صحابہ اور اسلاف امت رمضان میں صدقات اور حسن سلوک زیادہ کرتے تھے اور رمضان میں زکوٰۃ ادا کرتے تھے تاکہ جس کو زکوٰۃ دیں اس کو روزہ رکھنے میں تقویت حاصل ہو۔

اے تاجرو! اللہ نے تم کو مال کی نعمت سے نوازا ہے اور مال جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے ادھر اُدھر مائل ہوتا رہتا ہے۔وہ مال خیر ہے جس سے اللہ کو بھلائی مقصود ہو اور یہ چیز گھوڑے کے مانند ہے، ایک آدمی کے لئے باعث اجر ہے، دوسرے کے لئے بوجھ ہے، صالح مال کیا ہی عمدہ ہوتا ہے صالح شخص کے لئے، مخیّر لوگوں کو اجر ملتا ہے۔جس کو اللہ تعالیٰ مال عطا کر کے اچھا رزق دے اسے زکوۃ کی ادائیگی میں جلدی کرنی چاہئے، علانیہ اور چھپا کر اس کا انفاق کرنا چاہئے یہاں تک کہ اس کا مال دوسروں کے لئے باعث سعادت بن جائے کیونکہ انسان کا اصل مال وہی ہے جو اللہ کے پاس وہ پہلے ہی بھیج دے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا:'' يقول الإنسان مالى مالى هل لك من مالك إلا ما أكلت فأفنيت أو لبست فأبليت أو تصدقت فأمضيت'' انسان کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال، تمہارا مال کیا کوئی اس کے علاوہ ہے جو تم کھاتے ہو اور ختم کردیتے ہو یا پہن کر بوسیدہ کردیتے ہو، یا صدقہ کر کے اسے بھیج دیتے ہو۔

اس کے علاوہ جو مال ہوتا ہے انسان اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور دوسرے وارث ہوتے ہیں۔چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے:﴿وأنفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه فالذين آمنوا منكم وأنفقوا لهم أجر كبير﴾ (الحدید:۷) اور اس میں سے تم انفاق کرو جس کا اللہ تعالیٰ نے تم کو وارث بنایا ہے پس تم سے جو ایمان لائے اور انھوں نے انفاق کیا، ان کے لئے بڑا اجر ہے۔

ایک حدیث میں ہے:'' ان النبی ﷺ قال: ما طلعت شمس يوم إلا وبجنبيها ملكان يناديان

یاأیها الناس هلموا الی ربکم فان ماقل وکفیٰ خیر مما کثر وألهیٰ اللهم أعط منفقا خلفا وأعط ممسکا تلفا'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی دن بھی سورج طلوع نہیں ہوتا ہے مگر یہ کہ افق پر دو فرشتے پکارتے ہیں اے لوگو! اپنے رب کی طرف آؤ اگر تمہارے پاس مال کم ہے لیکن ضرورتوں کو کافی ہے تو اس سے بہتر ہے کہ مال زیادہ ہو اور خدا سے غافل کردے اے اللہ انفاق کرنے والے کو عطا کر اور بخیل کا مال تلف کردے۔

بعض لوگ زکوٰۃ اور صدقہ کو بوجھ سمجھتے ہیں اور ان کے دل پر بڑا گراں گذرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ومن الأعراب من یتخذ ما ینفق مغرما﴾ دیہاتیوں میں سے کچھ لوگ انفاق کرتے ہیں اس کو بوجھ مانتے ہیں۔

اسی مزاج کے بعض شہری بھی ہوتے ہیں، لوگ اس زمانہ میں امانت کو مال غنیمت اور زکوٰۃ کو یاک ٹیکس سمجھتے ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ زکوۃ مالِ غنیمت ہے۔ ٹیکس نہیں اس شخص کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ فعل خیر کی توفیق عطا فرمائے۔ ذکر الٰہی شکر خداوندی اور اس کے حسن عبادت میں معاونت کرے جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچ جاتے ہیں وہی لوگ کامیاب و کامراں ہیں۔ ایک شاعر نے کہا:

ولم أر کالمعروف تدعی حقوقه مغارم فی الأقوام وهی مغانم

میں نے بھلائی کے کاموں کی طرح کسی چیز کو نہیں پایا کہ لوگ اس کے حقوق کو بوجھ اور ٹیکس سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ان کے لئے مال غنیمت کا درجہ رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انفاق کرنے والوں کی تعریف میں فرمایا ہے کہ: ﴿ الذین ینفقون أموالهم ابتغاء مرضاة الله وتثبیتا من انفسهم﴾ جو لوگ اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی رضا جوئی کے لئے اور اپنے اندر جماؤ اور اطمینان پیدا کرنے کے لئے۔

یعنی ان کو یقین اور اطمینان ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ خرچ کیا ہے اس سے بہتر بدل ان کو ملے گا، صدقہ مال کم نہیں کرتا ہے بلکہ زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ وما انفقتم من شئ فهو یخلفه وهو خیر الرازقین﴾ اور جو بھی تم نے خرچ کیا اللہ اس کا بدل عطا کرے گا۔ وہ بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿من ذ الذی یقرض الله قرضا حسنا فیضاعفه له أضعافا کثیرة﴾ (البقرۃ: ۲۴۵) کون ہے وہ شخص جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے گا، پس وہ اس میں کئی گنا اضافہ کردے گا۔

یہ شاندار اضافہ اس کو حاصل ہوتا ہے جو دنیا میں آخرت سے قبل صدقہ کرتا ہے، دنیا میں اس کا رزق کشادہ ہوتا ہے۔ اس کی تجارت اور سودے میں برکت ہوتی ہے۔

اگر تم نے اس کا تجربہ کیا ہوگا تو معلوم ہوگا۔ سنو اور اطاعت و فرمانبرداری کرو اور انفاق کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور جو اپنے نفس کے بخل سے بچا وہی کامیاب و کامراں ہے۔

رمضان میں اعمال کا ثواب کئی گنا ہوجاتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے ایک عورت سے جو آپ کے ساتھ حج نہ

کرسکی کہا:'' اعتمری فی رمضان فان عمرة فی رمضان تعدل حجة ''رمضان میں عمرہ کرو کیونکہ رمضان میں عمرہ کرنا حج کرنے کے برابر ہے۔

یہ حدیث بخاری ومسلم نے ابن عباس سے روایت کی، مسلم نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کی ایک عورت جس کا نام ام سنان تھا کہا؛

''ما منعك أن تحجي معنا قالت: لم يكن عندنا الا ناضحان فحج أبو ولدي وابنه على ناضح وترك لنا ناضحا ننضح عليه قال: فإذا جاء رمضان فاعتمري فان عمرة فی رمضان تعدل حجة ''ہمارے ساتھ حج کرنے میں تم کو کیا چیز مانع ہوئی؟ عورت نے کہا ہمارے پاس صرف دو پانی لادنے والے اونٹ تھے میرے لڑکے کے باپ نے اور بیٹے نے ایک اونٹ پر حج کیا اور دوسرا اونٹ ہمارے لئے چھوڑ دیا، جس پر ہم لوگ پانی لادتے تھے آپ نے فرمایا کہ جب رمضان آئے تو عمرہ کرلینا کیونکہ رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔

اور ایک روایت میں ہے:'' تعدل حجة معی ''میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔

رمضان کے عمرہ کے لئے بھی ضروری ہے میقات سے احرام باندھا جائے اور طواف سعی اور حلق کے باقی اعمال رمضان میں پورے کئے جائیں۔ مکہ میں لوگ مقیم رہیں ان کو عمرہ کرنے کے لئے تنعیم آنے کی ضرورت نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ اور صحابہ میں کسی کو سوائے عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس کا حکم نہیں دیا، جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مدینہ واپس نہ ہوسکیں تو ان کے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ تنعیم سے احرام بندھوادیں تاکہ ان کا دل خوش ہوجائے یہ سنت نہیں ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کا یہی خیال ہے۔

مکہ میں رمضان کے روزے رکھنے کا معاملہ ایک مستقل عمل ہے اس کا عمرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس سلسلہ میں ایک کمزور حدیث ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ اپنی سنن میں روایت کی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:" من ادرك رمضان بمكة فصامه و قام منه ما تيسر كتب له مأة الف شهر ''جس نے رمضان مکہ میں پایا، اس میں روزہ رکھا اور جتنا ہوسکا اتنی نماز پڑھی اللہ تعالیٰ اس کا ثواب لاکھ مہینوں کی عبادت کے برابر تحریر کرے گا۔

رمضان میں اور مکہ میں اعمال کا ثواب کئی گنا ہوجاتا ہے نصوص صحیحہ سے ثابت ہے یہ زمان ومکان کی عظمت کی وجہ سے ہے اس لئے فرض نماز اور نفل نماز کا ثواب کئی گنا ہوجاتا ہے جیسا کہ امام احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے ابوزبیر رضی اللہ عنہ سے یہ صحیح حدیث روایت کی:'' عن أبي الزبير قال: قال رسول الله ﷺ صلوة فی مسجدی هذا أفضل من ألف صلوة فيما سواه إلا المسجد الحرام وصلوة فی المسجد الحرام أفضل من صلوة فی مسجدی هذا بمائة صلوة۔ ''ابوزبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مسجدوں کی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنا میری اس مسجد میں سو نمازیں پڑھنے سے افضل ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے:''عن أبی هريرة أن النبی ﷺ قال لأصحابه: هل أصبح أحد منكم اليوم صائما؟ قال أبوبكر: انا قال وهل أحد تصدق بصدقة؟ قال أبو بكر: انا قال: وهل أحد منكم عاد مريضا؟ قال أبوبكر! انا قال: وهل أحد منكم تبع جنازة؟ قال أبوبكر: انا قال: والله ما اجتمعت هذه الخصال فی امرئ إلا ادخله الله بهن الجنة۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کیا تم سے کوئی آج روزے سے ہے۔ابوبکر نے کہا،''میں''، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''کیا کسی نے آج صدقہ کیا ہے؟ ابوبکرؓ نے کہا میں نے، آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کسی نے مریض کی عیادت کی؟ ابوبکرؓ نے کہا میں نے، پھر فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی نے جنازہ کی متابعت کی؟ ابوبکرؓ نے کہا میں نے، رسول اللہ ﷺ نے اس پر ارشاد فرمایا کہ کسی آدمی میں یہ تمام عادتیں نہیں جمع ہوں گی مگر یہ کہ اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ (ماخوذ از: مجموعہ رسائل)

☆☆☆

ماہ رمضان کے روزے کی فرضیت

فرمان الٰہی: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیَ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيْدُ اللّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلاَ يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُواْ الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُواْ اللّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں، تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے اسے روزہ رکھنا چاہئے، ہاں جو بیمار ہو یا مسافر ہو اسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنی چاہئے، اللہ تعالی کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں، وہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرلو اور اللہ تعالی کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں بیان کرو اور اس کا شکر کرو۔(تفسیر جونا گڈھیؒ)

ماہ رمضان میں خیر کے دروازے

فرمان نبوی: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو خیر کے دروازے نہ بتاؤں، میں نے کہاں ہاں، اے اللہ کے رسول! فرمایا: روزہ ڈھال ہے اور صدقہ گناہ کو ختم کردیتا ہے جس طرح سے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور مرد مومن کی نماز نصف شب کو ہوتی ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَطَمَعاً وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ، فَلا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاء بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (السجدۃ:۱۶-۱۷)

ترجمہ: ان کے پہلو خواب گاہوں کو چھوڑ دیتے ہیں، اپنے رب کو خوف اور لالچ سے پکارتے ہوئے اور جو ہم ان کو رزق دیتے ہیں اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور کوئی شخص نہیں جانتا ہے جو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اللہ تعالی نے اس سے پوشیدہ رکھی ہے، ان کے اعمال کے بدلہ کے نتیجہ میں۔

خلیفۂ اول صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تنقیص اور شیعہ

(۳)

مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی
استاذ جامعہ رحمانیہ، بنارس

غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے رفیق:

تمام مورخین اور سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ غزوہ بدر اور دیگر تمام غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے رفیق رہے، کوئی غزوہ آپ سے چھوٹا نہیں، حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے سات غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شرکت کی، اس کے علاوہ دیگر جنگی مہموں میں جنہیں رسول اللہ ﷺ روانہ فرماتے تھے، ان میں سے نو میں شرکت کی، کبھی ابوبکر ہمارے امیر ہوتے اور کبھی اسامہ ؓ، یہاں میں غزوۂ بدر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کردار کے متعلق گفتلو کروں گا۔

جہاد کے فرض ہونے کا حکم آچکا ہے، آپ ﷺ ابوسفیان کے تجارتی قافلے کے تعاقب میں نکلے وہ بچ کر نکل گیا ہے، معلوم ہوا کہ قریش ایک ہزار جنگ جو لے کر مدینہ پر یلغار کرنے کے لئے آرہے ہیں، وہ آلات حرب سے پوری طرح مسلح ہیں، ادھر مسلمانوں کے پاس سامان حرب کی کمی ہے، تعداد بھی یوں ہی سی ہے، حالات نامساعد ہیں، مسلمان شش وپنج میں ہیں کہ ایسی زبوں حالی میں ہم کافروں سے مورچہ کیسے لیں گے، رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام سے مشورہ چاہتے ہیں، زبانیں خاموش ہیں، کون ہے جو منشا نبوی کو سمجھے؟ یہ دیکھ کر منشائے الٰہی اور منشائے نبوت کے رازداں ابوبکر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، فورا بھانپ لیا کہ آپ ﷺ کیا چاہتے ہیں، حمایت حق کے لئے آواز بلند کی اور مسلمانوں کو کارگہ شہادت میں کود پڑنے کے لئے للکارا، آپ کی شعلہ بیانی نے مسلمانوں کے دلوں کو گرما دیا، اس کے بعد عمر فاروق، سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ نے جوشیلی تقریریں کیں، صحابہ کرام کے دلوں میں ایمانی حرارت اور جوش وولولہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

رسول اللہ ﷺ ٹیلے پر سائبان میں اللہ سے الحاح وزاری کررہے ہیں، حفاظت کے لئے ابوبکر تلوار لئے کھڑے ہوئے ہیں، سعد کی قیادت میں نوجوانوں کی ایک جماعت پہرہ دے رہی ہے، آپ ﷺ دعاؤں میں مصروف ہیں: "اللهم أنجز لی ما وعدتني اللهم ان تهلك هذه العصابة من أهل الاسلام فلا تعبد في الأرض أبدا" اے اللہ تو نے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر اگر مسلمانوں کا یہ گروہ ہلاک ہوگیا تو روئے زمین پر تیری عبادت کبھی نہ ہوگی۔ دعا کرتے ہوئے آپ کی چادر شانوں سے گرگئی، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چادر کو دوبارہ آپ کے شانوں پر ڈال دیا اور عرض کیا: یارسول اللہ کافی ہوگیا، اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿اذ یستغیثون ربکم فاستجاب لکم﴾ (۱)

(۱) صحیح مسلم: کتاب الجہاد، باب الامداد بالملائکۃ ببدر: ۳/۱۳۸۴۔

غزوۂ بدر اسلام میں سب سے اہم غزوہ تھا، یہ حق و باطل کی فیصلہ کن جنگ تھی، اگر خدانخواستہ مسلمان اس جنگ میں شکست کھا جاتے تو ہمیشہ کے لئے ان کا وجود صفحۂ ہستی سے ختم ہو جاتا، لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا، بدر کی اس جنگ میں اللہ نے رسول اللہ کی حفاظت، اسلام کی حمایت اور نصرت حق کا مبلغ صرف ابوبکر کو بنایا، اس جنگ سے اسلام کو جو قوت ملی اسے فراہم کرنے میں اور رسول اللہ ﷺ کا دست و بازو بننے میں ابوبکر کی عظمت وجلالت کا حریف کون ہوسکتا ہے؟

رسول اللہ ﷺ کی وفات اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی استقامت:

رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، محبت رسول سے سرشار صحابہ کرام کے ہوش وحواس گم ہیں، ہر شخص حیران اور پریشان ہے، کسی کو یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ اس دنیا میں نہیں رہے، اس سانحہ عظیم نے سب کو حواس باختہ کر دیا ہے، وفور غم نے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ کل نفس ذائقة الموت برحق ہے، حقیقت کے انکشاف کی کسی میں جرأت نہیں ہے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ حالت ہے کہ ننگی تلوار لے کر کہہ رہے ہیں کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ وفات پا چکے ہیں میں اس کی گردان اڑادوں گا، اگر ثابت قدم ہے تو استقامت کا وہ پہاڑ، جس کا محبوب اور چہیتا رفیق جدا ہو گیا، غموں سے نڈھال ہے، لیکن ذمہ داریوں کا شدید احساس مجبور کئے ہوئے ہے کہ غموں کا مداوا بنے اور لوگوں کو حقیقت کا ادراک کرادے، ورنہ اسلام کی نیّا کا خدا حافظ، فورا مسجد نبوی میں پہنچے عمر کو مخاطب کیا کہ قسمیں کھانے والے ٹھہر جا اور خاموش ہو جا اور پھر منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: ﴿فإن من كان يعبد محمدا فإن محمدا قد مات ومن كان يعبد الله فإن الله حي لا يموت﴾ وقال الله تعالى: ﴿انك ميت وانهم ميتون﴾ (الزمر:۳۰) وقال: ﴿وما محمد إلا رسول قد خلت من قبله الرسل أفإن مات أو قتل انقلبتم على أعقابكم ومن ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئا وسيجزي الله الشاكرين﴾ (آل عمران:۱۴۴)

ابوبکر کی یہ تقریر سنتے ہی لوگوں کے ہوش وحواس جاگ گئے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بیان ہے جیسے ہی ابوبکر کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا انتہائی متحیر اور دہشت زدہ ہو کر رہ گیا حتی کہ میرے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے، میں زمین پر گر پڑا اور جان گیا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ کی موت ہو چکی ہے۔

اس الم ناک وقت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قائدانہ صلاحیتیں جس طرح ابھر کر سامنے آئیں وہ نہایت حیرت انگیز ہے، آپ نے ایسے قیامت خیز اور الم انگیز وقت میں بھی ہوش وحواس کو قائم رکھا اور قرآن کی چند آیات سنا کر لوگوں کو حقیقت بتلادی، ورنہ شر انگیزیوں کا پورا امکان موجود تھا، یقیناً یہ انوار نبوت کا فیض تھا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ:

اسلامی تاریخ میں واقعہ سقیفہ بنی ساعدہ بے حد اہمیت کا حامل ہے، وہ دعوت عظیمہ جسے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے خون جگر سے سینچا تھا اور اسے ایک قد آور درخت بنا دیا تھا، ممکن تھا کہ معمولی سی غفلت اور لاپرواہی اسے زمیں دوز

کر دیتی مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن تھا، اسلامی ریاست کو ایک لمحہ کے لئے بغیر امام اور خلیفہ کے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا، ذات اقدس ﷺ کی تجہیز وتکفین ابھی نہیں ہوئی تھی، لیکن آپ ﷺ کے قریبی اعزہ علی، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما وغیرہ اس کام میں مصروف تھے، انصار بنوساعدہ کے سقیفہ میں خلافت کے اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جمع ہو گئے، مسئلہ کے حل کے لئے تجاویز پیش ہو رہی تھیں، انصار کے جلیل القدر صحابی سعد بن عبادہ کا نام خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے پیش ہو رہا تھا، ابوبکر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو اطلاع ملی فوراً اس جگہ پہنچے، امت کے مصالح، قیادت کے لئے استحقاق اور منشائے نبوی سے یہ دونوں حضرات بخوبی واقف تھے، عمر فاروق پہلے خود بات کرنا چاہتے تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں روک دیا اور خود حاضرین کو خطاب کیا، خطاب ایسا موجز اور جامع ومانع تھا کہ سارے لوگ مطمئن ہو گئے، عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے دل میں جو باتیں تھیں، مجھ سے بہتر طور پر ابوبکر نے پیش کیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے انصار کے فضائل کو بیان کیا، اللہ، اس کے رسول اور اسلام میں ان کے مقام اور مرتبہ کو واضح کیا، پھر آپ نے خلافت کے نشیب وفراز بتلائے اور فرمایا کہ عرب کے لوگ صرف قریش ہی کی قیادت کو تسلیم کر سکتے ہیں، جب آپ نے سعد بن عبادہ کو مخاطب کر کے حدیث نبوی سنایا اور یاد دلایا کہ اے سعد آپ بھی اس وقت موجود تھے، جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الأئمة من قريش" حدیث نبوی کا سننا تھا کہ انصار کی ساری تشویش دور ہوگئی، فوراً عمر فاروق رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس کے بعد مجلس کے تمام لوگوں نے آپ سے بیعت کی، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دوررسی اور حسن تدبیر نے ایسے نزاع کا خاتمہ کر دیا، جو خدانخواستہ اگر جنم لے لیتا تو اسلام کی تاریخ بدل دیتا۔

یہاں میں وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ بہت سے معاصر مورخین نے آج کے سیاسی انداز پر قیاس کرتے ہوئے واقعہ سقیفہ کو ایسا رنگ دینے کی کوشش کی کہ جیسے صحابہ کرام دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکے تھے، قبائلی عصبیت لوٹ آئی تھی، انصار سعد بن عبادہ کی قیادت میں الگ پارٹی بنا چکے تھے اور مہاجرین نے الگ گروپ بنالیا تھا، مہاجرین میں بھی اتفاق نہ تھا، علی اور زبیر رضی اللہ عنہما ابوبکر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے کٹے کٹے تھے، سعد مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو چکے تھے، یہ تمام ہفوات بالکل غیر مستند اور صرف داستان سرائی اور حاشیہ نگاری ہے اور حقیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، سعد بن عبادہ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں نہایت معزز اور معتبر تھے، وہ آپ کے نقبا میں تھے، غزوات میں آپ کے ساتھ شریک ہوئے، ایسے عظیم صحابی رسول کے متعلق یہ رائے رکھنا کہ وہ اقتدار کے بھوکے تھے اور حکمرانی کے حریص تھے، صرف گندی ذہنیت کا مظاہرہ ہے اور صحابہ کرام کو مطعون کرنے کی ناپاک کوشش ہے۔

زبیر اور علی رضی اللہ عنہما نے بیعت کرنے میں یقیناً تاخیر کی، لیکن اسکی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مستحق خلافت نہیں سمجھتے تھے اور خود کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے، حضرت علی تو بچپن سے دیکھ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک جان دو قالب تھے، ہر اہم معاملہ میں آپ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کا مشورہ قبول کرتے تھے، ان احادیث سے

واقف تھے جو آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں ارشاد فرمائیں، مرض الموت میں نماز کی امامت کے لئے ابوبکر کو منتخب کرنے کی وجہ بھی آپ بخوبی سمجھ رہے تھے، حضرت ابوبکر نے جب خلافت سے معذرت چاہی تو یہ حضرت علی ہی تھے، جنہوں نے فرمایا: ''واللہ نہ ہم آپ کو برطرف کر سکتے ہیں اور نہ برطرفی کا اعلان کر سکتے ہیں، جب آپ کو رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھایا تو بھلا آپ کو کون پیچھے کر سکتا ہے''۔(۱)

بیعت سقیفہ بنی ساعدہ میں شرکت نہ کرنے اور پیچھے رہ جانے کا سبب آپ ﷺ کی تجہیز وتکفین میں مشغولیت تھی، خود ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ ذمہ داری سونپی تھی چنانچہ وفات نبوی ﷺ کے دوسرے دن سہ شنبہ کو علی اور زبیر رضی اللہ عنہما دونوں نے بیعت کی، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: جب ابوبکر رضی اللہ عنہ (بیعت عامہ کے لئے) منبر پر تشریف لائے، دیکھا لوگوں میں زبیر موجود نہیں ہیں، ان کو بلوایا، وہ حاضر ہوئے، آپ نے ان سے کہا: ''اے رسول اللہ کے حواری اور پھوپھی زاد بھائی! کیا مسلمانوں کی جمعیت کو توڑنے کا ارادہ ہے؟'' عرض کیا: خلیفۂ رسول ایسی کوئی بات نہیں ہے؟ پھر آپ نے نظر دوڑائی، دیکھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نظر نہیں آرہے ہیں، ان کو بھی بلوایا، وہ حاضر ہوئے، آپ نے ان سے فرمایا: کیا مسلمانوں کی جمعیت کو توڑنے کا ارادہ ہے؟ عرض کیا: خلیفۂ رسول! ایسی کوئی بات نہیں ہے؟ پھر وہ آگے بڑھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کی۔(۲) ایک اور روایت میں ہے کہ جس وقت بیعت عامہ کے لئے مجلس منعقد ہو رہی تھی، علی رضی اللہ عنہ گھر میں ایک کرتا پہنے بیٹھے تھے، ازار کی بھی پرواہ نہیں کی، فوراً لپکے، مبادا بیعت میں پیچھے نہ رہ جائیں، بیعت کرنے کے بعد گھر سے چادر منگوائی اور اسے بطور تہبند لپیٹ لیا۔(۳)

عمرو بن حریث نے سعید بن زید سے بیعت ابی بکر کے بارے میں ایک انٹرویو لیا تھا، جس کا خلاصہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں کسی نے مخالفت نہیں کی، نہ انصار نے اور نہ مہاجرین نے، علی رضی اللہ عنہ تو کسی وقت آپ سے جدا نہ ہوئے، اور نہ کسی جماعت میں آپ سے کٹ کر رہے، مسلمانوں کے امور اور مشوروں میں برابر کے شریک رہے۔(۴)

ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مسئلہ خلافت:

ابوبکر رضی اللہ عنہ نہ خلافت کے خواہاں تھے اور نہ اس کے متمنی، وہ بار بار اس عظیم ذمہ داری کو اٹھانے سے معذرت کر رہے تھے، انہیں نہ اقتدار کی خواہش تھی، نہ دولت وثروت کی آرزو تھی، اور نہ دنیاوی جاہ وحشم کی پرواہ تھی، منصب کی خواہش نہ ان کا اور نہ صحابہ کرام کا مزاج تھا، لیکن خلافت آپ کے لئے مقدر ہو چکی تھی، بے پناہ صلاحیتوں اور جامع الکمالات ہونے کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول نے آپ کو خلیفہ منتخب کیا تھا، آپ من جانب اللہ اور من جانب الرسول خلیفہ تھے، آپ کی خلافت پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے، آپ کی خلافت کے برحق ہونے سے انکار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا انکار

(۱) دکتور علی محمد محمد الصلابی: ابوبکر صدیق ص ۲۰۲، اردو ترجمانی شمیم احمد السلفی (۲) البدایۃ والنہایۃ: ۲۴۹/۵۔
(۳) الخلفاء الراشدون للخالدی ص ۵۶۔ (۴) حوالہ سابق۔

ہے اور اس قسم کا منکر زمرۂ اسلام سے خارج ہوگا۔

اللہ رب العالمین نے قرآن میں ثانی اثنین کہہ کر پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا، رسول اللہ ﷺ کے بعد ہمیشہ دوسرے ابوبکر تھے، ہیں اور رہیں گے، رسول اللہ ﷺ تکلیف اور مرض کی شدت کی وجہ سے مسجد نبوی میں تشریف نہیں لا سکتے ہیں، اجلۂ صحابہ آپ کی آمد کے منتظر ہیں، ان میں عمر فاروق بھی ہیں، عثمان ذوالنورین بھی ہیں، حیدر کرار بھی ہیں، امین الامۃ بھی ہیں، فقیہ الامۃ عبداللہ بن مسعود اور معاذ بن جبل بھی ہیں، حبر الامۃ عبداللہ بن عباس بھی ہیں، لیکن نیابت رسول کا شرف صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوتا ہے، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا دبی زبان سے کہتی ہیں، یا رسول اللہ انہیں آگے نہ بڑھائیے، وہ بڑے رقیق القلب ہیں، نماز پڑھانا ان کے لئے مشکل ہو جائے گا، آپ ﷺ ان کی معذرت کو رد کر دیتے ہیں اور ابوبکر رضی اللہ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی امامت کرائیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ شرف اس لئے ملا کہ لوگ جان جائیں کہ امامت کبری کے بارے میں ذات قدسی صفات کا منشا کیا ہے اور نبوت ورسالت کی چشم وآبرو کا رخ کس طرف ہے، صحابہ کرام سے زیدہ فہم وفراست اور دین کی سمجھ کس کے پاس تھی، انہوں نے وہی کیا جو اللہ اور اس کے رسول کی خواہش تھی، اللہ اور اس کے رسول نے صراحت کے ساتھ کسی کو خلافت اور نیابت رسول کے لئے نامزد نہیں کیا، کیونکہ اسلام ابد تک کا دین ہے، مصالح امت کا تقاضا تھا کہ خلافت کا فیصلہ مسلمان خود کریں، لیکن دربار رسالت کے اشارے ضرور ملتے رہے کہ خلافت رسول کے حق دار ابوبکر کی ذات ہے، اب ذرا احادیث کے ذخیرہ سے چند حدیثیں بھی سماعت فرمائیے جن میں رسول اللہ ﷺ نے خلافت کے لئے ابوبکر کی طرف اشارہ کیا۔

(۱) صحیح بخاری کی روایت ہے راوی جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ ہیں، ایک خاتون رسول اللہ ﷺ کی خدمی میں حاضر ہوئیں، رسول اللہ ﷺ نے انہیں دوبارہ آنے کا حکم دیا، انہوں نے عرض کیا: اگر میں آؤں اور آپ نہ ملیں (یعنی آپ کی وفات ہو چکی ہو)، آپ نے فرمایا: ''اگر تم مجھے نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس حاضر ہو جانا''۔(۱) بقول حافظ ابن حجر کے آپ رسول اللہ ﷺ کے وعدوں کی تکمیل کی ذمہ داری خلیفہ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

(۲) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مجھے نہیں معلوم کہ کتنے دن تمہارے درمیان رہو، لہذا میرے بعد ان کی اقتدا کرنا''، یہ کہتے ہوئے آپ نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی جانب اشارہ کیا، اس حدیث میں خلافت کے بارے میں صریح اشارہ موجود ہے۔

(۳) ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض الموت میں مجھے حکم دیا: ''تم میرے پاس ابوبکر اور اپنے بھائی کو بلاؤ، میں ان کے لئے تحریر لکھ دوں، کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے اور کہنے والا کہے کہ میں (خلافت کا) زیادہ حقدار ہوں، حالانکہ اللہ اور اہل ایمان صرف ابوبکر کو چاہتے ہیں۔ حدیث بالکل واضح ہے کہ اہل

(۱) البخاری: ۳۶۵۹، مسلم: ۵۶/۴، ۱۸۵۷۔

ایمان صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا پسند کریں گے اور اس میں اللہ کی رضامندی شامل ہے۔

(۴) ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت نماز کے بارے میں فرمان نبوی ہے: "مروا أبا بكر فيصل بالناس" ابوبکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، آپ لوگوں کو جمعرات سے دوشنبہ تک نماز پڑھاتے رہے، جس دن آپ کا انتقال ہوا، پردہ ہٹا کر آپ نے دیکھا کہ لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں، آپ یہ دیکھ کر نہایت درجہ مسرور ہوئے۔(۱)

(۵) آپ کا ارشاد ہے کہ اگر میں روئے زمین پر کسی کو دوست بناتا تو ابوبکر کو دوست بناتا، تاہم اسلامی اخوت کا رشتہ زیادہ قوی ہے، مسجد میں کھلنے والی تمام کھڑکیاں ابوبکر کے دریچہ کے سوا بند کردی جائیں۔(۲)

(۶) رسول اللہ ﷺ نے اپنا خواب بیان کیا کہ آپ حوض رپ تھے، لوگوں کو اس سے پانی پلا رہے تھے، پھر ابوبکر آئے اور آپ کے ہاتھ سے ڈول لے کر پانی نکالنے لگے، تاکہ آپ کو آرام ملے۔(۳)

خلافت ابوبکر کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ایک تبصرہ جوان کی مشہور تصنیف منہاج السنۃ سے ماخوذ ہے، ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا، آپ نے اس سلسلے کی تمام احادیث اور علماء کی آراء ذکر کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا وہ یقیناً حق پر مبنی ہے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صحت، اس کا ثبوت اور آپ کی خلافت سے اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی پر نصوص صحیحہ دلالت کر رہی ہیں، آپ کی خلافت پر مسلمانوں کی بیعت منعقد ہو چکی تھی، صحابہ کرام نے ان نصوص کی بنیاد پر آپ کو خلیفہ منتخب کیا، جن میں اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے آپ کی تفصیل اور برتری وارد ہوئی ہے، آپ اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں خلافت کے سب سے زیادہ حق دار تھے، لہذا آپ کی خلافت نص اور اجماع دونوں سے ثابت ہے، آپ کی خلافت سے اللہ اور رسول اللہ کی رضامندی پر نص دال ہے، آپ کی خلافت برحق ہے، اللہ نے اس کا حکم دیا ہے، اور اسے مقدر کیا ہے کہ اہل ایمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کریں گے، یہ اسلوب بہ نسبت مجرد عہد اور تعیین کے زیادہ مؤثر اور بلیغ ہے، کیونکہ محض عہد کی صورت میں، اس کا ثبوت صرف عہد و تعیین کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن جب بغیر عہد و تعیین کے مسلمانوں نے آپ کو خلیفہ بنایا اور نصوص نے اس کو درست ٹھہرایا، اللہ اور اس کے رسول نے اس کو پسند فرمایا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صدیق اکبر اس قدر فضائل کے حامل تھے کہ آپ کی شخصیت دوسروں سے جدا تھی، جس کی وجہ سے اہل ایمان نے آپ کو اس منصب خلافت کا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حق دار سمجھا اور ایسی صورت میں عہد و تعیین کی ضرورت باقی نہ رہی''۔(۴)

(جاری)

☆☆☆

(۱) سیرۃ ابن ہشام، بخاری (۲) مسلم: ج ۲/۔
(۳) مسلم: ج ۴/ص ۶۲-۱۸۶۱۔ (۴) منہاج السنۃ ج ۱/ص ۱۳۹۔

بلوغ المرام اوراس کا منہج تدریس

(قسط:۱)

مولانا عبدالمتین مدنی

اسلامی تعلیمات کے دو بنیادی مصادر ہیں، ایک کتاب اللہ اور دوسرا سنت رسول، قرآن کے الفاظ ومعانی دونوں اللہ کی طرف سے رسول ﷺ پر نازل ہوئے اور حدیث کے الفاظ اگر چہ نبی کریم ﷺ کے ہیں مگر اس کا معنی ومفہوم اللہ کی طرف سے ہے، اس لیے اسے وحی خفی یا غیر وحی متلو کہا جاتا ہے،، قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿وما ينطق عن الهوى، ان هو إلا وحي يوحى﴾ (۱) اور وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے، فرمان نبوی ہے: "ألا إني أوتيت القرآن ومثله معه" (۲) سنو مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اسی جیسی چیز دی گئی، یہ اسی جیسی چیز اس لیے دی گئی تا کہ آپ اللہ کے کلام کی تشریح وتفسیر کریں، فرمان الہی ہے: ﴿وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم﴾ (۳) ہم نے آپ پر ذکر کو اس لیے اتارا تا کہ آپ جو ان کی طرف نازل کیا گیا اس کی تشریح کر دیں۔

اس مختصر تمہید سے شرعی مصادر میں علم حدیث کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اسی لیے علم حدیث کو شرعی علوم کی کلید اور اسلامی شریعت کی بنیاد بھی کہا گیا ہے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر مدارس دینیہ میں کتب حدیث کی تدریس کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے، اگر چہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے عصر سے پہلے تک حدیث کی تدریس پر زیادہ توجہ مرکوز نہ تھی، علوم عقلیہ کا غلبہ تھا، حدیث کے بجائے فقہ کی تدریس کو اہمیت دی جاتی تھی، شاہ صاحب کی کوششوں سے حدیث پر توجہ کا آغاز ہوا، الحمد للہ آج دینی مدارس میں حدیث کی تدریس کا کام ہو رہا ہے، برصغیر کے اہلحدیث مدارس کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ مختلف درجات میں مشہور کتب حدیث مثلا صحاح ستہ، موطا امام مالک، مشکاۃ المصابیح اور بلوغ المرام کی تدریس کے علاوہ علوم حدیث کی تدریس مثلا مصطلح، جرح وتعدیل، تدوین، دفاع اور تخریج جیسے علمی وفنی مواد بھی پڑھائے جاتے ہیں، فالحمد للہ علی ذلک۔

محترم حضرات! بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام کے منہج تدریس پر گفتگو کرنے سے پہلے میں یہ واضح کر دوں کہ علماء نے احادیث نبویہ پر مختلف قسم کی کتابیں لکھی ہیں، بعض علماء نے احادیث احکام پر مستقل کتابیں مرتب کیں اور ان کتابوں کو فقہی ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا تا کہ فقہی مسائل کے دلائل بآسانی جانے جاسکیں۔

اس سلسلہ کی مشہور کتابیں عمدۃ الاحکام تالیف حافظ ابومحمد عبدالواحد المقدسی، المنتقی من اخبار المصطفیٰ تالیف عبدالسلام

(۱) النجم:۳ (۲) مسند احمد ۴/۱۳۱، سنن ابی داود ح:۴۶۰۴۔
(۳) النحل:۴۴۔

ابن تیمیہ الحرانی، الاحکام فی أحادیث الاحکام اور الاتمام فی احادیث الاحکام تالیف ابن دقیق العید، المحرر فی احادیث الاحکام تالیف ابن عبدالہادی اور بلوغ المرام من أدلۃ الاحکام تالیف شہاب الدین احمد بن حجر العسقلانی۔

بلوغ المرام کے مولف محتاج تعارف نہیں، آپ اس امت کے ان برگزیدہ افراد میں سے ایک ہیں جن کو شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب کیا گیا اور آپ کی عظمت وشرف کے لیے آپ کی سب سے عظیم تالیف فتح الباری شرح صحیح البخاری ہی کافی ہے جس کے بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا جب آپ سے صحیح بخاری کی شرح لکھنے کا مطالبہ کیا گیا: لا هجرة بعد الفتح۔ (۱)

بلوغ المرام کی تالیف کا سبب اور اس کی تاریخ

حافظ ابن حجر نے بلوغ المرام کے مقدمہ میں اس کتاب کی تالیف کا سبب ان الفاظ میں بیان کیا ہے: فهذا مختصر يشتمل على أصول الأدلة الحديثية للأحكام الشرعية حررته تحريرا بالغا ليصير من يحفظه من بين أقرانه نابغا، ويستعين به الطالب المبتدى ولا يستغنى عنه الراغب المنتهي" (۲) یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو احادیث میں احکام شرعیہ کے بنیادی دلائل پر مشتمل ہے میں نے اس کی تہذیب میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے تاکہ اسے یاد کرنے والا اپنے ساتھیوں میں ماہر بن جائے اور مبتدی طالب علم اس سے مدد حاصل کرے۔ رغبت رکھنے والا منتہی طلبہ اس سے بے نیاز نہ رہے۔ اس سلسلہ میں آپ کے شاگرد امام سخاوی لکھتے ہیں: جن اسباب نے انہیں اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا ان میں سے ایک ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ ان کا اکلوتا بیٹا محمد اس کتاب کو یاد کرے۔ (۳)

اس کتاب کی تالیف سے حافظ ابن حجر ۸۲۸ھ میں فارغ ہوئے اور آپ کے صاحبزادہ محمد کی پیدائش ۸۱۵ھ کی ہے، گویا جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو اس وقت محمد کی عمر ۱۳ سال تھی۔ (۴)

اس کتاب کی تالیف سے متعلق امام سخاوی نے ایک اور اہم بات ذکر کی ہے: اختصره من الالمام وزاد عليه كثيرا۔ (۵) بلوغ المرام درحقیقت ابن دقیق العید کی کتاب الالمام فی احادیث الاحکام کی مختصر ہے، حافظ نے اس کتاب کے اختصار کے ساتھ دوسری کتابوں سے منتخب احادیث کا اس میں اضافہ بھی کیا ہے، اس لیے اس کتاب کی حدیثیں اصل کتاب یعنی الالمام کی حدیثوں سے زیادہ ہوگئیں، الالمام میں ۱۴۷۱ حدیثیں ہیں، جبکہ بلوغ المرام میں حدیثوں کی تعداد ۱۵۶۹ ہے۔ اس کتاب کی احادیث کے مصادر ومراجع سے متعلق اس کتاب کے ایک معاصر شارح شیخ عبداللہ عبدالرحمٰن البسام (مکہ مکرمہ) اپنی کتاب توضیح الاحکام میں "من أخرج لهم المؤلف في بلوغ المرام" یہ عنون قائم کیا اور اس کے بعد درج

(۱) فہرس الفہارس للکتانی ۱/۳۲۳۔ (۲) بلوغ المرام ۷، ۸۔
(۳) الجواہر والدرر: ۱۲۲۰۔ (۴) شرح بلوغ المرام للعودۃ: ۱/۲۶۔
(۵) الجواہر والدرر ص ۶۶۱۔

ذیل ۲۰/ائمہ حدیث کے ناموں کو ذکر کیا۔

۱-امام احمد بن حنبل الشیبانی	۲-امام محمد بن اسماعیل البخاری
۳-امام مسلم بن حجاج القشیری	۴-امام ابوداود السجستانی
۵-امام ابوعیسی الترمذی	۶-امام ابوعبدالرحمٰن النسائی
۷-امام ابن ماجہ القزوینی	۸-امام مالک بن انس الاصبحی
۹-امام محمد بن ادریس الشافعی	۱۰-امام ابن ابی شیبہ الکوفی
۱۱-امام ابن خزیمہ النیسابوری	۱۲-امام ابوبکر البیہقی
۱۳-امام ابوعبداللہ الحاکم النیسابوری	۱۴-امام ابن حبان البستی
۱۵-امام ابوالحسن الدارقطنی	۱۶-امام ابوالقاسم الطبرانی
۱۷-امام ابن السکن البغدادی	۱۸-امام ابن القطان
۱۹-امام ابوبکر احمد بن عمرو البصری	۲۰-امام ابن الجارود النیسابوری

ان اسماء گرامی کو ذکر کرنے کے بعد شیخ البسام تحریر فرماتے ہیں:

" هؤلاء هم الأئمة الذين انتقى الحافظ ابن حجر كتابه بلوغ المرام من أسفارهم" ان محدثین کرام کی کتابوں سے حافظ ابن حجر نے بلوغ المرام کی حدیثوں کو منتخب فرمایا ہے۔(۱) جبکہ استاذ محترم علامہ صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ اپنی شرح اتحاف الکرام شرح بلوغ المرام کے اخیر میں ایک عنوان قائم کرکے ان ائمہ ومحدثین کا مختصر ترجمہ ذکر کرتے ہیں جن کے اسماء تخریج حدیث یا جرح وتعدیل کے سلسلہ میں اس کتاب میں وارد ہیں، اوران کی تعداد مولانا کے شمار کے مطابق ۴۲ ہے۔(۲) دونوں شارحین کی تحریر کے بعد میں نے روایات اوران کی تخریج کا تتبع کیا تو میں نے یہ پایا شیخ البسام نے جن محدثین کے نام ذکر کئے ہیں وہ ان تمام محدثین کے نام نہیں ہیں جن کی حدیثیں اس کتاب میں موجود ہیں بلکہ کئی ایک محدثین کے نام چھوٹ گئے ہیں مثلا امام ابویعلی، امام بزار، امام سعید بن منصور، امام ابوعوانہ، امام ابن عدی، امام اسحاق بن راہویہ، اور میں نے پوری کتاب کا تتبع کیا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی محدثین ہوں جن کی کتابوں سے ابن حجر نے حدیثوں کو منتخب کیا ہو۔اس لیے استاذ محترم کی ذکر کردہ فہرست ہی مستند اور قابل اعتماد معلوم ہوتی ہے۔

(۱) توضیح الاحکام۔ (۲) بلوغ المرام مع الاتحاد: ۴۶۰-۴۷۱۔

خصوصیات بلوغ المرام

یہ عظیم کتاب کئی اہم خصوصیات کی حامل ہے جن کو اس کتاب کے شارحین اور علم حدیث کے باحثین نے ذکر کیا ہے، چند خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱- یہ کتاب شرعی احکام کے حدیثی دلائل پر مشتمل ہے، اس کتاب میں مصنف نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور غالبا صرف موضع شاہد پر ہی اکتفاء کیا ہے، کبھی کبھی ایسی حدیثیں جو مکمل ایک دو صفحہ میں ہیں ان کا ذکر سطر دو سطر میں کر دیا ہے مگر اس سے معنی مقصود میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

۲- بقدر ضرورت حدیث کے اخیر میں اس کا درجہ بیان کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے۔

۳- غالبا ہر باب میں سب سے پہلے صحیحین یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی حدیث کو ذکر کیا ہے، سنن وغیرہ کی روایت کو اس کے بعد ذکر کیا ہے تا کہ صحیح احادیث ہی مسائل کا مستند اور مرجع ہوں اور دوسری حدیثیں متممات ہوں۔

۴- ہر باب میں اس باب کی صحیح ترین حدیث ذکر کرنے کی کوشش کی ہے، متکلم فیہ یا ضعیف حدیث اس وقت ذکر کی ہے جب اس باب میں انہیں کوئی صحیح حدیث نہیں ملی۔

۵- حدیثوں کو مشہور کتب حدیث کے علاوہ دیگر کتابوں سے بھی منتخب کیا ہے اور ان کے مصدر کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا درجہ بھی بیان کر دیا ہے۔

۶- رواۃ کے سلسلہ میں جرح وتعدیل میں بھی ایجاز واختصار کو پیش نظر رکھا ہے اور مختصر الفاظ میں نہایت بلیغ معنی بیان کیا ہے۔

۷- حدیث کے عام یا اکثر طرق کا تتبع کر کے ان کی صحت یا طرق میں واقع علل کو بیان کیا ہے۔

۸- اگر کسی حدیث کے متابعات اور شواہد ہوتے ہیں تو ان کی طرف بھی اچھے انداز میں اشارہ کیا ہے۔

۹- اسی کتاب کی کتب، ابواب اور حدیثوں کی ترتیب کتب فقہ کی ترتیب پر مرتب کیا ہے تا کہ فقہی مسائل کے دلائل کا مراجعہ کرنا آسان ہو۔

۱۰- کتاب کے اخیر میں اخلاق وآداب سے متعلق ایک باب رکھا ہے الجامع من الآداب، تا کہ احادیث احکام کا قاری اچھے اخلاق سے متصف ہو۔

۱۱- زیادہ تر حدیثی دلائل جن کے فقہاء کرام مسائل میں استدلال کرتے ہیں، ان کو بغیر کسی تعصب وجانبداری کے جمع

کردیا ہے اوران پر حکم بھی لگانے کا عموما اہتمام کیا ہے۔(۱)

الغراض یہ کہ بلوغ المرام مختصر مگر جامع اور نفیس کتاب ہے۔

شروحات کتاب

اللہ تعالی نے اس کتاب کو عام مقبولیت عطا فرمائی ہے، دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے شروح، حاشیے اور ترجمے لکھے گئے، اس کی مشہور شرحوں میں البدر التمام تالیف شیخ الحسن بن محمد المغربی (مخطوط) سبل السلام تالیف محمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی، یہ کتاب البدر التمام کی تلخیص ہے اور مصنف نے اس میں مفید اضافے اور مسائل میں اپنی فقہی آراء کو بھی ذکر کیا ہے۔

فتح العلام تالیف نواب صدیق حسن خاں، یہ سبل السلام کی مختصر ہے اور نواب صاحب کے اس کتاب میں اضافے بھی ہیں۔

مسک الختام (فارسی) تالیف نواب صدیق حسن خاں

فقہ الاسلام تالیف عبد القادر شیبۃ الحمد

توضیح الاحکام تالیف عبد اللہ عبد الرحمٰن البسام

اتحاف الکرام تالیف مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

فتح ذی الجلال والاکرام تالیف شیخ محمد بن عثیمین

شرح بلوغ المرام (کتاب الطہارۃ) تالیف سلمان بن فہد العودۃ، یہ مؤلف کے دکتوراہ کا رسالہ ہے، کاش مؤلف اس کو اسی منہج پر مکمل کردیں، تو اس کتاب کی یہ ایک عمدہ شرح ہوگی، مکتبہ الرشد ریاض سے مطبوع ہے۔

مذکورہ بالا شرحوں سے تدریس میں مدد لی جاسکتی ہے، خاص طور سے سبل السلام، فتح ذی الجلال والاکرام، توضیح الاسلام اور اتحاف الکرام بڑی اہم اور مفید شرحیں ہیں۔

بعض احادیث کی تفصیلی شرح اور مسائل کی مزید تنقیح وتوضیح کے لیے نیل الاوطار للشوکانی اور تیسیر العلام للبسام بھی بڑی معاون کتابیں ہیں۔ (جاری)

☆☆☆

(۱) شرح بلوغ المرام للعودۃ: ۱/۲۷-۲۹، علوم الحدیث: مطالعہ وتعارف: ۴۳۹، ۴۴۰۔

تیمّم کے احکام ومسائل کتاب وسنت کی روشنی میں

(قسط:۲)

عبدالولی عبدالقوی
مکتب دعوۃ وتوعیۃ الجالیات، سعودی عرب

٤- جنابت کی حالت میں تیمم:

جس طرح وضو کے بدلہ تیمّم جائز ہے اسی طرح پانی نہ ملنے یا اس کے استعمال سے عاجزی کی صورت میں غسل جنابت کے بدلہ بھی تیمّم جائز ہے۔

عمران رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، جب نماز سے پھرے تو اچانک آپ کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو لوگوں سے الگ بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی، رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا اے فلاں! لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے تمہیں کس چیز نے روکا؟ انہوں نے کہا: مجھے جنابت لاحق ہوئی اور پانی نہ مل سکا، آپ ﷺ نے فرمایا: تم پر مٹی (سے تیمّم کرنا) لازم ہے، پس وہ تمہارے لئے کافی ہے۔(بخاری ، التیمم باب الصعید الطیب وضوء المسلم ح:٣٤٤، مسلم، المساجد باقضاء الصلاۃ الفائتۃ ح:٦٨٣)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس واقعہ میں جنبی کے لئے تیمّم کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔''(فتح الباری ج:١/ ٥٣٧)

امام ترمذی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''تمام فقہاء کا یہی کہنا ہے کہ جنبی اور حائضہ جب پانی نہ پائیں تو تیمّم کر کے نماز پڑھیں۔''(ترمذی ص:٣٣)

٥- تیمم کو توڑدینے والی چیزیں:

١- جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، انہیں چیزوں سے تیمّم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔(المغنی ج:١/ ٣٥٠)

کیوں کہ تیمّم وضو کے قائم مقام ہے، لہذا جن چیزوں سے وضو ٹوٹے گا، انہی چیزوں سے تیمّم بھی ٹوٹ جائے گا، مثلاً کسی نے چھوٹی ناپاکی کی صورت میں تیمّم کیا، پھر اس نے پیشاب کیا یا وضو کو توڑ دینے والی کوئی چیز اسے لاحق ہوئی تو اس کا تیمّم باطل ہو گیا۔

٢- اگر پانی کی عدم موجودگی کی بنا پر تیمّم کر لیا تو پانی مل جانے کی صورت میں تیمّم ٹوٹ جائے گا۔ جیسا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے گرچہ دس برس پانی نہ پائے اور جب پانی پائے، تو اس کو اپنے چمڑے سے لگائے یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔''۔

أبوداؤد ، الطھارۃ ح: ٣٣٢، ترمذی ١٢٤، نسائی ٣٢٣، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے دیکھئے: صحیح ابواداؤد ١/ ٦٧ ح:٣٢١، مشکاۃ المصابیح ١/ ١١٥ح: ٥٣٠

۳- اگر پانی کے استعمال سے عاجزی کی صورت میں تیمّم کیا ہوتو عاجزی کے زائل ہوجانے اور پانی کے استعمال پر قادر ہوجانے سے تیمّم ٹوٹ جاتا ہے۔(الملخص الفقهی للفوزان: ۷۲)

٦- وہ شخص جو پانی اور مٹی دونوں نہ پائے :

جوشخص کسی ایسی جگہ پر ہو جہاں پانی اور مٹی دونوں نہ پائے تو وہ بغیر وضو اور بغیر تیمّم کے نماز پڑھے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے اپنی (ہمشیرہ) اسماء رضی اللہ عنہا سے ہار منگنی لیا اور وہ کہیں گر گیا تو رسول اللہ ﷺ نے کسی کو تلاش کرنے کے لئے بھیجا، ہار تو مل گیا لیکن اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا لوگوں کے پاس پانی نہیں تھا، اس لئے انہوں نے بے وضو نماز پڑھ لی، لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی، تو اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی آیت نازل فرمادی۔

بخاری ، التیمم ح:۳۳٦، مسلم ، الحیض ح:۳٦۷

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس حدیث میں دلیل ہے کہ اس شخص پر نماز واجب ہے جو پانی اور مٹی دونوں نہ پائے، کیوں کہ صحابہ نے پانی نہ پانے کی صورت میں بھی نماز کو واجب سمجھ کر اس کی ادائیگی کی اور اگر ایسے وقت میں بلا وضو نماز پڑھنا ممنوع ہوتا تو نبی ﷺ ان کے اس عمل پر نکیر کرتے، امام شافعی، احمد، جمہور محدثین اور اصحاب مالک کا یہی کہنا ہے۔'' (فتح الباری ج:۱/ ۵۲٤)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فاتقوا الله مااستطعتم﴾ (التغابن:۱٦) پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔اور نبی ﷺ نے فرمایا:'' فاذا نهيتكم عن شئ فاجتنبوه و اذا أمرتكم بأمر فاتوا منه ماستطعتم ''۔

جب میں تمہیں کسی بات سے روکوں تو اس سے اجتناب کرو اور جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو طاقت بھر اس کی تعمیل کرو۔بخاری، الاعتصام ح:۲۱٤۸، مسلم ، الحج، ح:۱۳۳۷

صاحب دلیل الطالب لکھتے ہیں:

''اگر پانی اور مٹی دونوں نہ پائے تو جس حالت میں بھی ہو قدر کفایت صرف فرض پڑھ لے اور پانی یا مٹی مل جانے پر نماز نہ دہرائے۔'' دیکھئے: دلیل الطالب ج۱/ ٦۷

۷- ہر نماز کے لئے تیمم:

بعض فقہاء کا خیال ہے کہ ہر نماز کے لئے تیمّم ضروری ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک نماز کا وقت ختم ہوجانے سے تیمّم ٹوٹ جاتا ہے، لیکن یہ قول محل نظر ہے۔

صحیح یہ ہے کہ وقت کے نکلنے سے تیمّم نہیں ٹوٹتا ہے بلکہ ایک تیمّم سے کئی نمازیں جائز ہیں جب تک کہ تیمّم کو توڑ دینے والی کوئی چیز لاحق نہ ہو، مثلاً اگر کسی نے نماز ظہر کے لئے تیمّم کیا تو عصر ومغرب اور عشاء وغیرہ بھی پڑھ سکتا ہے جب تک کہ اپنے تیمّم پر برقرار رہے، ہر نماز کے لئے تیمّم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تیمّم مطلقا پانی کے قائم مقام ہے، چنانچہ تیمّم سے وہی چیزیں جائز قرار دی جائیں گی جو پانی سے جائز قرار دی جاتی ہیں اور نماز کا وقت ہونے سے پہلے بھی تیمّم جائز ہوگا جس طرح وقت سے پہلے وضو جائز ہے اور یہ تیمّم نماز کا وقت ختم ہوجانے پر بھی باقی رہے گا جس طرح پانی سے حاصل کی گئی طہارت نماز کا وقت ختم ہوجانے پر بھی باقی رہتی ہے۔'' (مجموع فتاوی ابن تیمیہ ج:۲۱/۴۳۶)

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''آپ ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ہر نماز کے لئے جداگانہ تیمّم فرماتے اور نہ ہی آپ نے اس کا حکم دیا بلکہ تیمّم کو ٹھیک وضو کے قائم مقام قرار دیا ہے۔'' (زادالمعاد ج:۱/۲۰۰)

علامہ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''درست بات یہ ہے کہ تیمّم نماز کا وقت ختم ہوجانے سے باطل نہیں ہوتا ہے، اگر آپ نے نماز فجر کے لئے تیمّم کیا اور عشاء تک اپنی طہارت پر باقی رہے تو آپ کا تیمّم صحیح ہے۔'' (الشرح الممتع ج:۱/۳۴۰)

۸- تیمم سے نماز پڑھ لینے کے بعد پانی مل جانا:

اگر تیمّم سے نماز پڑھ لینے کے بعد پانی مل جائے یا اس کے استعمال پر قدرت حاصل ہو جائے تو نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے، نماز کا وقت ہوگیا اور ان دونوں کے پاس پانی نہ تھا، ان دونوں نے پاک مٹی سے تیمّم کرکے نماز پڑھ لی، پھر نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے پانی مل گیا تو ان میں سے ایک نے وضو کرکے دوبارہ نماز پڑھی اور دوسرے نے دوبارہ نماز نہ پڑھی، پھر دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اس معاملہ کا ذکر کیا، تو آپ ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: جس نے دوبارہ نماز نہ پڑھی تھی، تو نے سنت کو پالیا اور تمہاری پہلی نماز تمہارے لئے کافی ہوگئی اور جس نے وضو کرکے دوبارہ نماز پڑھی تھی اس سے فرمایا: تجھے دوہرا ثواب ملے گا۔

ابوداؤد، الطهارة ح:۳۳۸ ، نسائی ۴۳۱ ، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دیکھئے: صحیح ابوداؤد ج:۱/۶۹ ح:۳۲۷، مشکاة المصابیح ج:۱/۱۱۶ ح:۵۳۳)

۹- کیا تیمم کے لئے اپنے ہاتھوں کو مٹی پر دوبار مارنا ثابت ہے؟

بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ تیمّم کے لئے اپنے ہاتھوں کو مٹی پر دوبار مارا جائے اور کہنیوں تک تیمّم کیا جائے۔ ان کا مستدل عبداللہ بن عمر رضی اللہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''التيمم ضربتان: ضربة للوجه وضربة لليدين الى المرفقين''

تیمّم کے لئے اپنے ہاتھوں کو مٹی پر دوربار مارنا ہے ایک بار چہرے کے لئے اور دوسری بار دونوں ہاتھوں کے لئے کہنیوں

تک۔(دارقطنی، الطھارۃح:۶۸۵، المعجم الکبیر ۱۲ /۳۶۷، مستدرک حاکم ج:۱ /۲۸۷ح:۶۳۴)

واضح رہے کہ اس حدیث کی سند میں علی بن ظبیان راوی ہیں جس کی وجہ سے اہل علم نے اس حدیث کوضعیف قراردیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علی بن ظبیان بغداد کے قاضی ضعیف ہیں۔'' دیکھئے: تقریب التھذیب ج:۱ /۴۰۲

ابن نمیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علی بن ظبیان ضعیف ہیں، اپنی تمام تر حدیثوں میں غلطی کرتے ہیں۔ یحی بن سعید، ابن معین اور ابوداؤد رحمہم اللہ نے کہا: لائق اعتبار نہیں ہیں۔نسائی، ابوحاتم الرازی اور ازدی رحمہم اللہ نے کہا: متروک ہیں۔ابوزرعہ رحمہ اللہ نے کہا: غایت درجہ ضعیف ہیں۔دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا:ضعیف ہیں۔ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا: ان کی مرویات قابل احتجاج نہیں ہیں۔'' (دیکھئے:الضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج:۲ /۱۹۵)

یحی بن معین رحمہ اللہ نے کہا:علی بن ظبیان کذاب خبیث ہیں۔(دیکھئے:میزا ن الاعتدال فی نقدالرجال ج:۵ /۱۶۳)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ علی بن ظبیان کو قطان ابن معین اور بہت سے اہل علم نے ضعیف قرار دیا ہے۔''(دیکھئے:تلخیص الحبیر ج:۱ /۱۵۱)

ابوحاتم البستی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علی بن ظبیان کوفہ کے رہنے والے بغداد کے قاضی تھے، وہ احادیث میں الٹ پلٹ کردیا کرتے تھے اور جان نہیں پاتے تھے، آثار میں غلطی کرتے تھے اور سمجھ نہیں پاتے تھے، جب ان کی روایتوں میں ایسا بکثرت ہونے لگا تو محدثین نے ان کی احادیث کو نا قابل احتجاج قرار دیا۔''(دیکھئے:المجروحین لابی حاتم البستی :۲ /۱۰۵)

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''تیمّم کے لئے اپنے ہاتھوں کو مٹی پر دوبار مارنے والی حدیثیں ضعیف ہیں۔''(المغنی:ج:۳۲۲۱)

حافظ ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''رہا مسئلہ ان تینوں حدیثوں کا جن سے لوگوں نے تیمّم کے دوضربہ ہونے پر استدلال کیا ہے، تو ان سبھی احادیث میں علت اور ضعف ہے، ان میں سے کسی سے بھی دلیل پکڑنا جائز نہیں ہے۔''(الأوسط لابن المنذر ج:۲ /۵۳)

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے کہ آپ نے تیمّم کے لئے اپنے ہاتھوں کو دوبار مٹی پر مارا ہو اور کہنیوں تک تیمّم کیا ہو۔'' (زادالمعادج:۱/۲۰۰)

☆☆☆

بہ یاد استاذ محترم ڈاکٹر مقتدی حسن ازہریؒ

عبدالسمیع محمد ہارون سلفی

یہ چند سطور نہ تو ڈاکٹر مقتدی حسن صاحب ازہریؒ کی حیات وخدمات کی بابت ہے اور نہ ہی ان کی وفات کے بعد، جیسا کہ خواص کی وفات کے بعد ہوتا ہے، رسما وروایۃ چند سطور حوالۂ تحریر کرنے جیسی کوئی بات ہے، دراصل یہ تحریر ایک ایسے شاگرد کی ہے جس نے کم سے کم چھ سال سے زائد کے عرصہ تک ان سے قریب رہنے کے علاوہ بالمشافہ ملاقات وقتا فوقتا کے علاوہ کبھی کبھار مراسلہ نگاری کے ذریعہ ان کے احوال وکوائف جانتے ہوئے قریب رہا ہے۔ ۳۰/ اکتوبر ۲۰۰۹ء کی اس صبح کو تادیر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ استاذ محترم، اس قدر صحتمند، تنومند اور فعال ومتحرک شخصیت کیوں کر اور کیسے اس طرح ہم سے جدا ہو جائیں گے، مگر عزیز گرامی اسامہ صغیر احمد مدنی نے جب یقین دلایا تو بہر حال دنیا کی اس ایک ٹھوس ترین حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑا کہ "اذا جاء أجلهم لا يستأخرون ساعة ولا يستقدمون" اور کہ موت وہ شئی ہے کہ وہ اپنے موعود وقت پر آکے رہے گی، "ولو كنتم في بروج مشيدة" ابھی کل کی بات ہے کہ استاذ محترم مدھوبنی آئے تھے، ہم اپنے ایک ساتھی وفد جن میں ارشد مدنی جامعہ ابن تیمیہ، مظہر مدنی جامعہ فیض عام مئو کے علاوہ کئی ایک مقتدر احباب واخوان تھے، کے ہمراہ جب ان سے ملنے گئے، تو ابتدائی گفتگو میں ہی وہ بول پڑتے ہیں کہ عزیزو! اب تو ہم لوگ رخت سفر باندھے ہیں کہ رب کریم کی جانب سے بلاوا قریب ہی معلوم ہوتا ہے، اب تو ملت اور جماعت کی خدمت اور اس کی ذمہ داریاں آپ ہی جیسے لوگوں کے سر عائد ہونے والی ہیں، اور یہ بھی کہ ہم مطمئن ہیں کہ ان شاء اللہ آپ جیسے لوگ اس ذمہ داری کو کما حقہ ادا کرنے کے اہل ہوں گے، ان شاء اللہ، بخدا جب استاذ محترم یہ فرمارہے تھے تو ایسا قطعا احساس نہیں تھا کہ وہ بالکل سچ فرمارہے ہیں کہ واقعتہ اب ان کا بلاوا بالکل قریب ہے اور یہ کہ ہماری ان سے آخری ملاقات ہے، اللہ ان پر کروٹ کروٹ رحمت فرمائے، آمین۔

آج جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں انہیں یاد کرتا ہوں تو وہ اپنی ابتداء ملاقات سے لیکر آخر تک یاد آتے ہیں، جامعہ سلفیہ بنارس میں ایک مدرس، وکیل، مدیر اور منتظم ونگراں سبھی حیثیت میں ہم لوگوں نے ان کو جس قدر بارعب وفعال پایا اسی قدر شفیق اور حد سے سوا مخلص بھی پایا، بارعب تو وہ اس قدر تھے کہ طلبہ تو طلبہ اساتذہ بھی ان کے دفتر میں موجودگی کے وقت گذر جانے کی سکت نہیں پاتے تھے، الا یہ کہ ان کا گذرنا ضروری ہو، جب تک جامعہ میں وہ موجود ہوتے، خواہ دفتر میں یا اپنے کمرہ میں جامعہ کے وسیع وعریض احاطہ میں ہر جگہ اپنی موجودگی کا مکمل احساس کروادیتے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی دن جامعہ سے باہر ہوتے تو اساتذہ کی بابت وثوق سے نہیں البتہ طلبہ کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ وہ خود کو فری اور ریلیکس محسوس کرتے، اللہ نے ان کو ظاہری ساخت کے اعتبار سے بھی جس قدر بارعب بنایا تھا وہ اپنے فکر وعمل کے اعتبار سے بھی لوگوں کے دلوں میں احترام اور عزت رکھتے تھے، مگر یہ اس حد تک بھی نہیں تھا کہ جو طلبہ اور ان سے ملنے والوں کے لئے باعث وحشت ہو جیسا کہ عموما بارعب لوگوں کے تعلق سے دیکھا اور سنا جاتا ہے، جب آدمی ان سے ملتا تب ان کو احساس ہوتا کہ وہ جس قدر بارعب ہیں ملنے پر آدمی ان سے اسی قدر مانوس ومسرور ہو جاتا ہے۔

ناچیز کو اپنی بڑی بچی کے علاج ومعالجہ کے تعلق سے کئی ایک بار دہلی اور بنارس وغیرہ کا سفر کرنا پڑا، کبھی قصدا اور کبھی اتفاقا ان سے ملاقات ہوجایا کرتی تھی، استاذ محترم بچی کی بیماری کے تعلق سے باخبر تھے، جب بھی ملتے ان کی بابت سب سے پہلے دریافت کرتے، مفید مشورے دیتے اور پھر آخر میں نیک دعاؤں سے نوازتے، آپ کی گفتگو کا اندازہ کچھ اس طرح ہوتا کہ ان سے مل کر دل ودماغ ان کے حسن اخلاق کے سبب تادیر مسرور وشادماں محسوس کرتا، جامعہ سلفیہ بنارس میں مدت قیام کے بعد سے لیکر اس کے بعد تک اس طرح کے احساسات وجذبات کے لمحات کئی ایک ہیں۔

حرکت وعمل کی بابت جب ان کو یاد کرتا ہوں تو ہر جگہ خلوص وانہماک کے ساتھ نظر آتے ہیں، وقت ضائع کئے بغیر ہر جگہ اپنے وقت مقررہ پر ہونا کوئی ان سے سیکھے، آفس میں آمد ہو یا کلاس میں، مسجد میں آمد ہو یا پھر کہیں اور، وہ وقت کے بلا کے پابند تھے، جامعہ میں رہتے ہوئے انہوں نے ملت وجماعت کی جو خدمت کی اس بابت بہت کچھ لکھا جائے گا، مگر مدت قیام جامعہ میں جامعہ کے تنظیمی امور کی بابت ان کے افکار واعمال بلاشبہ بڑے نرالے اور دوررس ہوا کرتے تھے، غالبا ۸۲-۱۹۸۱ء کی بات ہے جب جامعہ میں بہت معمولی بات کے لئے زبردست ہڑتال طلبہ نے کردیا تھا، ثابت شدہ حقائق کی بنیاد پر جامعہ نے غالبا اپنی پوری زندگی میں اتنا بدترین بحران اور برادن نہیں دیکھا، مگر استاذ محترمؒ ان چند لوگوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اس بدترین بحران اور دن سے جامعہ کو اللہ کے فضل وکرم سے نکالنے میں اپنی بے پناہ صلاحیت کا ثبوت دیا تھا، ہمیں ایک اور واقعہ یاد آتا ہے، جامعہ میں اس وقت افریقہ، انڈونیشیا وملیشیا کے کئی طلبہ زیر تعلیم تھے، میں افریقی طلبہ کے ہمراہ خالی اوقات میں انگریزی تکلم کی خاطر زیادہ وقت دیا کرتا تھا، ایک مرتبہ ان کے ہمراہ ہم لوگ فٹ بال کھیلنے گئے، بنارس کے چند ہندو لڑکوں نے ان کے خاص رنگ وڈھنگ کے گھنگھر وبال کو ایک دوبار ہنسی مذاق میں چھو دیا، اب کیا تھا، افریقیوں کی بابت جتنا غصہ سنا تھا، دیکھ لیا، اس لڑکے کو افریقی نے پوری طاقت سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا، لڑکا ادھ مرا ہوگیا، ہنگامہ ہوگیا، ہر چند کہ وہ دور آج کے مقابلے میں پُرامن تھا، استاذ محترم تک بات پہنچی، فورا افریقیوں کو جامعہ کے دفتر میں طلب کیا گیا، اس دن جس فراٹے اور غم وغصہ میں ڈوب کر جس طرح عربی بولتے ہوئے استاذ محترم کو سنا سب حیرت زدہ تھے، استاذ محترمؒ کے جلال ورعب کا افریقی طلبہ پر کچھ اس طرح اثر ہوا کہ وہ جب تک جامعہ میں رہے کم از کم ان سے سب سے زیادہ خائف ومرعوب رہے، بعد میں کئی ایک مسائل اور مشکلات کے سبب جامعہ نے بیرون ملک کے طلبہ کو داخلہ لینا بند کردیا، پھر یہ لوگ بھی چلے گئے، جامعہ سلفیہ بنارس بلاشبہ ان کی خدمتوں کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا، وہ ملت وجماعت کے بے لوث خادم تھے، وہ جماعت اور ملت کی خدمت کے ساتھ اپنی ہمہ جہت سرگرمیوں میں تادم آخر مصروف عمل رہے، آج جب ان کے بعد ان کی شخصیت کو یاد کرتا ہوں تو جامعہ سے لیکر مرکزی جمعیت تک، رزم سے لیکر بزم تک ان کے بغیر سناٹا محسوس کرتا ہوں، دل سینے میں ماتم کناں ہے اور احباب فغاں سنج کہ ع: ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے۔ اللہ استاذ محترم کی خطاؤں کو معاف فرمائے، ان کے حسنات کو قبول فرما کر اعلی علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ملت وجماعت کو ان کا بہتر بدل عطا فرمائے، آمین۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

☆☆☆

شہادت حسینؓ ایک تحقیقی جائزہ

تحریر: أبو عبد الله الذهبي / ترجمہ: عبد الغفار سلفی (قسط:۴-۴)

قتل حسین سے متعلق یزید بن معاویہؒ کا موقف

عبیداللہ بن زیاد نے یزید بن معاویہ کو خط لکھا اور اس کو پورے واقعہ کی خبر دی اور مشورہ طلب کیا کہ حضرت حسین کے بیٹوں اور عورتوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ جب یہ خبر یزید بن معاویہ کو ملی تو وہ رو پڑے اور کہا میں اہل عراق کی اطاعت سے بغیر قتل حسین کے بھی خوش تھا، اللہ کی لعنت ہو ابن مرجانہ پر! اس نے حسینؓ کو رشتہ داری میں بہت دور پایا، اللہ کی قسم اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو حسین سے درگذر کرتا، اللہ حسین پر رحم کرے۔ (تاریخ طبری ۳۹۳/۵، اس روایت کے تمام رواۃ ثقہ ہیں سوائے مولی معاویہ کے وہ مبہم ہے، بلاذری نے اس روایت کو انساب الاشراف ۲۱۹/۳، ۲۲۰ میں حسن سند سے ذکر کیا ہے)۔

ایک روایت میں ہے کہ یزید نے کہا سنو اللہ کی قسم ابن زیاد کی جگہ اگر میں حسین کے ساتھ ہوتا اور ان کو قتل سے بچانے کے لیے مجھے اپنی زندگی کا کچھ حصہ بھی قربان کرنا پڑتا تو میں دریغ نہ کرتا (اس روایت کو) جوزقانی نے الاباطیل والمناکیر ۲۶۵/۱ میں اسی سند سے روایت کیا ہے جس کے سبھی راوی ثقہ ہیں مگر اسمیں شعبی اور مدائنی کے درمیان انقطاع پایا جاتا ہے)

طبقات ابن سعد (۳۹۳/۵) میں ایک جماعت کی سند کے ساتھ یہ روایت ہے کہ یزید نے جواب لکھا کہ قیدیوں کو اس کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ ذکوان ابو خالد نے فوراً پیش قدمی کی اور حضرت حسین کے گھر والوں کو چار ہزار درہم دیے اور اسی سے ان لوگوں نے تجہیز وتکفین کی۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ ابن زیاد نے حضرت حسین کے گھر والوں کے ساتھ کوئی دردناک سلوک نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ زنجیروں میں جکڑ کر یزید کے پاس لے گئے تھے جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے، بلکہ یزید نے ابن زیاد کو جو جواب لکھا وہ اس کی امیدوں کے برعکس تھا، اسے تو امید تھی کہ یزید اسے کوفہ پر برقرار رکھے گا، لیکن یزید نے اس کے عمل کی تائید نہیں کی بلکہ اس کو سخت برا بھلا کہا اور حضرت حسین کے ساتھ اس کے سلوک کے سلسلے میں بہت ناراض ہوا، اور یہی بہت بڑا محرک تھا، اس بات کا کہ حضرت حسین کے گھر والوں کو ان کے شایان شان حالت میں یزید کے پاس لے جایا جائے۔

اسی لیے شیخ الاسلام منہاج السنۃ (۵۵۹/۴) میں فرماتے ہیں:

''یہ بات جو بیان کی جاتی ہے کہ حضرت حسین کے گھر کی عورتیں اور بچے قیدی بنائے گئے اور ان کو شہروں میں گھمایا گیا اور ان کو بغیر کجاوے کے اونٹوں پر لادا گیا تو یہ سب جھوٹ اور باطل ہے، اللہ کا شکر ہے کہ نہ تو مسلمان قید ہوئے اور نہ ہی کبھی کوئی ہاشمی خاتون اور نہ ہی کبھی امت محمدیہ نے کسی ہاشمی عورت کے قیدی بنائے جانے کو حلال ٹھہرایا ہے، لیکن جاہل اور نفس پرست لوگ جھوٹ اور دروغ گوئی کے خوگر ہوتے ہیں''۔

امام طبری (۴۶۴/۵) عوانہ کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت حسین کے بیٹے یزید کے پاس پہنچے تو فاطمہ

بنت حسین نے کہا اے یزید! کیا اللہ کے رسول کی صاحبزادیاں قیدی ہوں گی؟ تو یزید نے کہا نہیں بلکہ وہ تو باعزت اور آزاد ہوں گی، جاؤ اپنی چچازاد بہنوں کے پاس جاؤ تم دیکھو گی کہ جو تمہارا حال ہے وہی ان کا بھی ہے، فاطمہ کہتی ہیں کہ جب میں ان کے پاس گئی تو میں نے ایک بھی سفیانی عورت (یعنی یزید کے گھر کی عورت) ایسی نہیں پائی جو رو نہ رہی ہو۔

امام طبری (۴۶۴/۵) عوانہ کی سند سے روایت کرتے ہیں اور انساب الاشراف (۲۲۰/۳) میں بھی حسن سند سے روایت موجود ہے کہ جب حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) یزید کے پاس آئے تو یزید نے کہا: دوست! تمہارے والد نے ہمارے ساتھ قطع رحمی کا سلوک کیا اور انصاف سے کام نہ لیا، پھر اللہ نے ان کا وہ حال کیا جو تم نے دیکھا، یزید کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ کی مشیئت اور تقدیر کے مطابق ہوا، اس پر علی بن حسین نے سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۲ پڑھی دی: ﴿مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ یعنی زمین میں جو بھی مصیبت لاحق ہوتی ہے اور تمہارے نفسوں میں بھی جو مصیبت لاحق ہوتی ہے اس کے پہلے کہ ہم اسے وجود عطا کریں، وہ کتاب میں محفوظ ہے، بے شک اللہ کے لیے یہ آسان ہے۔

یزید نے اپنے بیٹے خالد سے کہا کہ وہ اس کا جواب دے، جب خالد کو کچھ نہیں سوجھا تو یزید نے کہا ان سے کہو اور پھر سورہ شوری کی آیت نمبر ۳۰ پڑھ دی: ﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ﴾ یعنی تمہیں جو بھی مصیبت لاحق ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے کرتوتوں کے سبب ہوتی ہے، اللہ تو بہت سارے امور کو درگذر کر دیتا ہے۔

امام ابن سعد نے طبقات (۳۹۷/۵) میں عمدہ سند سے نقل کیا ہے کہ یزید نے تمام ہاشمی خواتین کو بلوایا اور پوچھا کہ ان کی کون کون سی چیز لی گئی ہے؟ ہر عورت زیادہ سے زیادہ جتنا بتلا سکتی بتلائی اور یزید اس سے بھی دوگنا ان کو دیتا چلا جاتا، یزید صبح و شام کو بغیر علی بن الحسین کی معیت کے کھانا نہ کھاتا، یزید نے مدینہ سے خاندان بنو ہاشم اور حضرت علیؓ کے خاندان میں سے عمر دراز اور بزرگ حضرات کو بلوایا، ان کو بلوانے سے یزید کا مقصد اس بات کا اظہار تھا کہ اس کی نظر میں حضرت حسین اور ان کے اہل خاندان کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔

جب یہ حضرات شہر (دمشق) میں داخل ہوئے تو ان کا زبردست استقبال ہوا، ان کے پہنچنے کے بعد یزید نے حکم دیا کہ حضرت حسینؓ کے گھر کی خواتین اور ان کی صاحبزادیوں کو تیار کیا جائے، ان خواتین نے یزید سے جو چیز بھی طلب کی، اس نے حاضر کی اور شہر میں جب تک وہ موجود رہیں یزید نے ان کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کا حکم دیا، جب یہ لوگ چلنے لگے تو یزید نے حضرت علی بن الحسین سے کہا میں تو چاہتا تھا کہ آپ ہمارے یہاں کچھ اور عرصہ قیام کرتے تاکہ ہم آپ کے ساتھ صلہ رحمی کرتے اور حق قرابت کو نبھاتے۔

شیخ الاسلام (علامہ ابن تیمیہؒ) منہاج السنۃ (۵۵۹/۴) میں فرماتے ہیں:

''یزید نے حضرت حسین کے بچوں کی نہایت تعظیم و تکریم کی اور انہیں اختیار دیا کہ چاہیں تو یزید کے پاس قیام کریں اور چاہیں تو مدینہ چلے جائیں، ان لوگوں نے مدینہ لوٹ جانے کو پسند کیا''۔

طبری (۴۶۲/۵) کی روایت ہے کہ جب وہ لوگ دمشق چھوڑنے لگے تو یزید نے ایک بار پھر حضرت علی بن حسین سے معذرت کی اور کہا اللہ کی لعنت ہو ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر! اللہ کی قسم اس کی جگہ اگر میں ہوتا تو حضرت حسین کا ہر مطالبہ تسلیم کر لیتا اور ہر حال میں ان کو موت سے بچا لیتا، چاہے مجھے اس کے لیے اپنی کسی اولاد کی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑتی، لیکن اللہ نے وہی فیصلہ کر دیا تھا جو آپ نے دیکھا، آپ کو کوئی بھی ضرورت درپیش ہو تو مجھے ضرور خط لکھئے گا۔

طبقات (۳۹۷/۵) میں ابن سعد نے ایک عمدہ سند سے روایت کیا ہے کہ یزید نے حکم دیا کہ بنوسفیان کے خاندان کا ایک وفد حضرت حسین کے گھر والوں کے ساتھ جائے اور ساتھ میں جانے والوں کو یزید نے یہ بھی تاکید کی کہ یہ لوگ جب اور جہاں ٹھہرنا چاہیں وہاں پڑاؤ ڈال دینا، یزید نے ان کے ساتھ محرز بن حریث کلبی کو بھی بھیجا تھا جو شام کے شرفاء میں سے تھے۔

حضرت حسین کے اہل وعیال دمشق سے مکمل ادب واحترام کے ساتھ نکلے، یہاں تک کہ وہ لوگ مدینہ پہنچ گئے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یزید نے حسینؓ کے اہل وعیال کی تعظیم وتکریم کی اور ان کا جو بھی نقصان ہوا تھا اس کی بھرپائی کی، بلکہ کئی گنا زیادہ دیا، اور ان کو ڈھیر سارے ساز وسامان اور ادب واحترام کے ساتھ مدینہ روانہ کیا۔ (البدایۃ والنہایۃ ۲۳۵/۸)

یزید بن معاویہ پر جو الزام بنیادی طور پر لگایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت حسین کے قتل کا عملی طور پر سبب وہی تھا۔

میں کہتا ہوں: یزید بن معاویہ رحمہ اللہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے مسلمانوں کے خلیفہ تھے، لوگ ان کے زیر نگیں تھے، ان کی وفات تک صحابۂ کرام، تابعین عظام اور عامۃ الناس کی اکثریت ان کی خلافت کی معترف تھی، صحابہ میں سے صرف دو لوگ ایسے تھے جنہوں نے ان کی بیعت نہیں کی تھی، حضرت حسین بن علی اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم۔

عراق کے شیعہ برابر حضرت حسین کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دے رہے تھے اور جب مسلم بن عقیل نے حضرت حسین کو خط لکھا کہ بیعت کرنے والے کثیر تعداد میں ہیں اور حالات ان کے لیے سازگار ہیں تو وہ عراق روانہ ہوئے، اور اگر ہم اس عرصہ کے دوران حسینؓ کے متعلق یزید کے موقف کا جائزہ لیں جس میں حضرت حسینؓ نے کلی طور پر یزید کی بیعت سے انکار کیا تھا اور یہ عرصہ شعبان، رمضان، شوال، ذی قعدہ کا ہے تو ہم یہ پائیں گے کہ یزید نے کبھی مخالفین یعنی حضرت حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو گرفتار کرنے کے لیے کوئی لشکر نہیں بھیجا، بلکہ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا اور یزید کو ان کی بیعت یا مخالفت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اور جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے یزید تو سیاست میں اپنے والد (امیر معاویہؓ) کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے اور آخری لمحہ تک بردباری سے کام لیتے تھے، اپنے والد کی اس وصیت کو نبھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ حسینؓ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا، ان کے حق کو پہچاننا اور رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ان کی قرابت کا خیال رکھنا۔

یزید کی توجہ عراق کی جانب تھی، خاص طور سے کوفہ پر جہاں برائی پھیلانے والے اور حکومت میں اندرونی خلفشار مچانے والے تیزی سے فروغ پا رہے تھے، اسی لیے انہوں نے اس معاملے کا تدارک کرنے کے لیے عبیداللہ بن زیاد کو کوفہ کا امیر بنایا، ابن زیاد اپنی فطرت ذہانت اور دوراندیشی کی بنا پر کوفہ کو قابو میں کرنے اور وہاں پر شیعیت کے علمبرداروں کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسری طرف یزید بن معاویہ حضرت حسین کی حرکتوں سے غافل نہ تھا اور اسی لیے جب حسینؓ نے کوفہ جانے کا عزم کیا تو یزید نے ابن زیاد کو ایک خط لکھا جس میں حضرت حسین کے کوفہ کی جانب روانگی کی خبر دی اور کہا مجھے خبر ملی ہے کہ حسینؓ کوفہ کی جانب چل چکے ہیں اور (دکھ تو یہ ہے کہ) زمانوں میں تمہارا زمانہ، شہروں میں تمہارا شہر اور عمال میں تم ان کے ذریعہ آزمائے جارہے ہو، چوکیوں پر نگرانی بڑھادو، جس پر بھی شک ہو گرفتار کرلو، جو شخص بھی متہم ہو اسے پکڑ لو، لیکن ہاں! جو تم سے قتال کرے اسی کو قتل کرنا اور جو واقعات بھی پیش آئیں مجھے خبر دیتے رہنا۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ (یہ روایت مجمع الزوائد ۹/۱۹۳ میں ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، لیکن ضحاک اس واقعہ کے وقت موجود نہیں تھے، نیز طبری ۵/۳۸۰ میں بھی یہ روایت مذکور ہے)

یزید کی گفتگو (یعنی خط) کے ابتدائی حصے پر غور کرنے سے ہمیں یہ بات بخوبی محسوس ہوتی ہے کہ یزید ابن زیاد کی توجہ حضرت حسینؓ کے مقام ومرتبہ اور ان کی عظمت شان کی جانب مبذول کرانا چاہتا تھا، ورنہ یہ کہنے کا کیا مطلب کہ ''زمانوں میں تمہارا زمانہ، شہروں میں تمہارا شہر.....ان کے ذریعہ آزمائے جارہے ہو'' اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یزید قتل حسین کا خواہش مند ہرگز نہ تھا، کیونکہ انتہائی خوفناک صورت میں اپنے عامل کو ان کے بارے میں بتلایا تھا اور ایک طرح سے ان سے دور رہنے کی تلقین کی تھی، اس طرح سے یزید کا حضرت حسین کے معاملے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ابن زیاد ان کے مقابلے حسب استطاعت خوب تیاری کرلے، کیونکہ حضرت حسین ایک انتہائی قلیل جماعت کے ساتھ نکلے تھے اور یزید اس سے واقف تھا اور نہ ہی یزید کی عبارت سے ایسی کسی بات کا پتہ چلتا ہے کہ ابن زیاد حضرت حسین کا کام تمام کرنے کی کوشش کرے بلکہ اس کے خط کے دوسرے حصے میں ابن زیاد کو یہ لازمی حکم دیا گیا تھا کہ وہ زیادتی کرنے والے سے ہی قتال کرے، اسی طرح اس میں اس بات کی بھی سخت تاکید تھی کہ ابن زیاد ہر واقعہ کے سلسلے میں یزید سے ضرور رجوع کرے تاکہ آخری فیصلہ یزید کا ہو۔

جب حضرت حسین کوفہ کے قریب پہنچے تو ابن زیاد نے ان کے ساتھ وہ تدابیر اختیار کیں جن ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں، یہاں تک کہ جب ابن زیاد نے عمر بن سعد کو ایک دستے کا کمانڈر بنا کر حسینؓ کے پاس بھیجا تو اس دستے نے حضرت حسینؓ کو کربلا کے مقام پر روک دیا، جس دن حضرت حسینؓ کربلا پہنچے تو جمعرات کا دن اور محرم کی تین تاریخ تھی۔ (طبری ۵/۴۰۹)

حضرت حسین کے کربلا پہنچنے کے بعد بھی ابن زیاد اور حضرت حسینؓ کے درمیان باہم گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا، یہاں تک کہ دس محرم کو حضرت حسینؓ شہید کردیئے گئے، گویا باہمی گفت وشنید کا سلسلہ تقریباً ایک ہفتہ چلا اور یہ بات معلوم ہے کہ دمشق اور کوفہ کے درمیان کی مسافت دو ہفتے کے قریب تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن زیاد نے خود ہی حضرت حسینؓ کے قتل کا فیصلہ کرڈالا، نہ تو اس سلسلے میں یزید سے رجوع کیا اور نہ ہی اپنے اگلے قدم کے سلسلے میں یزید کا مشورہ لیا، اور اسی سے یہ صاف ہوجاتا ہے کہ یہ فیصلہ ابن زیاد کا اپنا مخصوص انفرادی فیصلہ تھا اور اس نے اس بارے میں یزید سے مشورہ تک نہیں لیا تھا، یہی وجہ ہے کہ یزید بار بار علی بن حسین سے تاکیدی طور پر یہ کہہ رہے تھے کہ انہیں شہادت حسین کا مطلق علم نہ تھا، ان کی خبر تو شہادت کے بعد یزید کے پاس پہنچی تھی۔

امید کہ مذکورہ واقعات میں اس بات کے واضح دلائل مل گئے ہوں گے کہ ابن زیاد نے قتل حسین کا جو قدم اٹھایا تھا، یزید کو اس کا علم نہیں تھا، مزید یہ کہ اس سے پہلے ہم صحابۂ کرام کے وہ اقوال پیچھے ذکر کرچکے ہیں کہ قتل حسین کی ذمہ داری اہل عراق پر آتی ہے اور ایک صحابی ہمیں ایسا نہیں ملتا جس نے اس واقعہ کے لیے براہ راست یزید کو متہم گردانا ہو، ان سب سے واضح طور پر یہ ثابت

ہوجاتا ہے کہ یزید قتل حسین کے ذرہ برابر ذمہ دار نہیں تھے، اب جہاں تک دلوں کا معاملہ ہے تو اس سے تو اللہ ہی واقف ہے، ہم دل کے خیالات کی بنا پر لوگوں کا فیصلہ نہیں کر سکتے بلکہ ظاہری طور پر جو ثابت ہوتا ہے ہم اسی کی بنیاد پر حکم لگاتے ہیں اور دلوں کے اسرار کا مالک اللہ ہے، وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، اسی لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ الوصیۃ الکبری (ص ۴۵) میں فرماتے ہیں: ''نہ تو یزید نے حسین کے قتل کا حکم دیا اور نہ ہی ان کی شہادت پر خوشی کا اظہار کیا''۔ دوسرے مقام پر منہاج السنۃ (۴/۴۷۲) میں فرماتے ہیں کہ ''مورخین کا اتفاق ہے کہ یزید نے حضرت حسین کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ اس نے ابن زیاد کو لکھا تھا کہ ان کو عراق کی حکومت سے باز رکھے، جیسا کہ حضرت حسین کا خیال یہ تھا کہ اہل عراق ان کی حمایت کریں گے اور اپنے خطوط میں کئے گئے عہد و پیمان نبھائیں گے لیکن جب ظالم دستہ سے ان کا سابقہ پڑا اور انہوں نے یہ پیش کش کی کہ انہیں یزید کے پاس یا سرحد کی جانب یا ان کے شہر کی طرف واپس بھیج دیا جائے تو ظالموں نے ان کی کوئی بات نہیں مانی، جب تک کہ وہ خود کو ان کی قید میں نہ دے دیں، حضرت حسین اس کے لیے تیار نہ ہوئے، ان لوگوں نے آپ سے قتال کیا یہاں تک کہ آپ مظلومانہ طور پر شہید کر دیے گئے''۔

طیب نجار کہتے ہیں: ''حضرت حسین کے قتل کے ذمہ دار عبید اللہ بن زیاد، شمر بن ذی الجوشن اور عمرو بن سعد تھے، یزید بن معاویہ کے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں آتی، وہ اس سے بھی بری ہیں کہ انہوں نے قتل حسین پر ابھارا تھا''۔ (الدولۃ الامویۃ ص ۱۰۳)

لیکن یزید بن معاویہ پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ انہوں نے ابن زیاد کے متعلق یا ان لوگوں کے متعلق جو حسین کے قتل میں شریک تھے کوئی واضح موقف ظاہر نہیں کیا، شیخ الاسلام فرماتے ہیں: حضرت حسین کی شہادت پر غم کے اظہار کے باوجود نہ تو یزید نے حضرت حسین کے قتل کی حمایت کی، نہ ان کے قاتلوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور نہ ہی ان سے انتقام لیا''۔ (منہاج السنۃ ۴/۵۵۸)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''نہ تو یزید نے ان سب کے باوجود ابن زیاد کو معزول کیا، نہ سزا دی اور نہ ہی اس کو کوئی ایسا خط لکھا جس میں اس کے عمل پر نکتہ چینی کی گئی ہو، واللہ اعلم''۔ (البدایۃ والنہایۃ ۹/۲۰۴)

شیخ الاسلام اور دوسرے حضرات نے یہ جو یزید پر اعتراض کئے ہیں ان کی اہمیت سے کسی کو مفر نہیں مگر اس زمانے کے حالات کا جائزہ لیا جائے جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا ہمارے لیے سخت دشوار ہوجاتا ہے، کوفہ کی حالت یہ تھی کہ جیسا کہ مشہور ہے وہ اس وقت شیعیت کا مرکز تھا، دوسرے وہ ایک ایسا شہر تھا جس کو کبھی قرار نہ تھا، جو اپنی بغاوتوں اور فتنوں کے لیے مشہور تھا، اپنی پارٹیوں اور فرقوں سے معروف تھا، جب حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کوفہ کے امیر ہوئے تو معاملات ان کے ہاتھ سے بے قابو ہونے لگے، لیکن جب یزید نے ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا تو اس نے بہت مختصر مدت میں حالات اپنے کنٹرول میں کر لیے، بغاوت کی آگ سرد پڑ گئی اور کوفہ پر اس کا مکمل تسلط قائم ہوگیا، یہاں تک کہ حضرت حسین کی شہادت کے بعد کوفہ کے امن وامان کو اور زیادہ خطرہ لاحق ہوگیا اور میں نہیں سمجھتا کہ یزید کو ان حالات میں ابن زیاد سے زیادہ چالاک اور طاقتور گورنر ملتا، پھر چاہے ابن زیاد معزول ہوجاتا خواہ باقی رہتا شیعہ بہر حال راضی نہ ہوتے اور حکومت کے خلاف ان کے دل کے بغض وعداوت میں کچھ بھی کمی نہ آتی، اور اگر یزید ابن زیاد کو برطرف کرنے کا قدم اٹھا دیتے تو خطرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا اور حالات ایک بہت بڑی بغاوت میں تبدیل ہوجاتے اور اس بغاوت کے سربراہ شیعہ اور وہ لوگ ہوتے جو شہادت حسین سے سخت کبیدہ خاطر تھے، جیسا کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد توابین کی تحریک کے نام سے ایسے لوگ سامنے آئے بھی۔ ☆☆

موت سے متعلق پانچ سوالات

ابوالبیان رفعت سلفی
مدرسہ صراط مستقیم، شیرور، کرناٹک

یاد رکھنا موت کا اکسیر ہے غم سے بچنے کی یہی تدبیر ہے

موت ایک ایسی ناقابل انکار حقیقت ہے جس سے کسی بھی انسان کو چھٹکارا نہیں ہے، خواہ کسی بھی رنگ ونسل، کسی بھی ذات وبرادری، کسی بھی قوم وملک اور کسی بھی دین ومذہب سے تعلق رکھنے والا ہو۔

اگر انسان کو اپنی موت یاد رہے تو اس کے اندر کبھی بھی کبر وغرور اور بے جا دنیاوی حرص ولالچ پیدا نہیں ہوگی، موت کی یاد سے قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں جوابدہی کا منظر نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے، جو لوگ موت کو یاد کر کے ہمیشہ اس کی تیاری کرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں وہی لوگ اللہ رب العالمین کی نظر میں عقلمند اور کامیاب ہونے والے ہیں، اس کے برخلاف جو لوگ موت سے غافل ہو کر صرف دنیاوی عیش وعشرت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، قرآن کریم ایسے لوگوں کو ناکام ونامراد قرار دیتا ہے، ارشاد ربانی ہے: ﴿بل تؤثرون الحياة الدنيا، والآخرة خير وأبقى﴾ تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو اور آخرت بہت بہتر اور بقا والی ہے۔ (سورۃ الاعلی: ۱۶-۱۷) کیونکہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے، جبکہ آخرت کی زندگی دائمی اور ابدی ہے، اس لیے عاقل فانی چیز کو باقی رہنے والی چیز پر ترجیح نہیں دیتا۔ (تفسیر احسن البیان ص: ۱۷۱۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لذتیں ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔ (الترمذی: ابواب الزھد، حدیث: ۲۳۰۷)

موت کا تصور اور اس کا ذکر انسانوں کو دنیاوی لذتوں میں انہماک اور معصیتوں کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے، اس لیے کثرت سے موت کو یاد کرنا چاہیے، اور موت کے بعد پیش آنے والے معاملات سے انسان کو غافل نہیں رہنا چاہیے۔ (ریاض الصالحین مترجم اردو: ۱/۵۰۷)

میں نے اپنے اس مقالہ کو پانچ سوالوں کے جوابات پر تقسیم کر دیا ہے: (۱) انسانی زندگی کی حقیقت اور اس کا مقصد کیا ہے؟ (۲) موت کس کو آئے گی؟ (۳) موت کب آئے گی؟ (۴) موت کہاں آئے گی؟ (۵) موت کیسے آئے گی؟

(۱) (الف) انسانی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ انسان کی روح کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کی روح کس شکل وصورت کی ہوتی ہے اور بدن میں کہاں چھپی رہتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ کے کھیتوں میں جا رہا تھا، اور آپ ﷺ ایک لکڑی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے، یہودیوں کی ایک جماعت سے جب آپ ﷺ کا گزر ہوا تو بعض یہودیوں نے کہا: ان سے روح کے بارے میں سوال کرو، بعض نے کہا: ان سے نہ پوچھو، شاید کوئی ایسا جواب دیں جو تمہارے خلاف ہو، جسے تم ناپسند کرو، بعض نے کہا: ہم ان سے ضرور پوچھیں گے، ان میں سے ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور بولا اے ابوالقاسم! روح کی کیا حقیقت ہے؟ آپ ﷺ خاموش رہے تو میں سمجھ گیا کہ اب آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے، اس لیے میں بھی خاموش کھڑا رہا، جب وحی نازل ہو چکی تو آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿ويسئلونك عن الروح قل الروح من أمر ربي وما أوتيتم من العلم إلا قليلا﴾ (سورہ بنی اسرائیل: ۸۵) اور یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ جواب دیجیے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورہ بنی اسرائیل باب ۱۳، حدیث: ۴۷۲۱)

روح کا اطلاق عظیم الشان فرشتہ جبرئیل علیہ السلام اور اس پوشیدہ چیز پر ہوتا ہے جو جسم انسانی میں پھیلی ہوتی ہے اور جس کے سبب انسان کا جسم زندہ رہتا ہے، یہاں یہی دوسرا معنی مراد ہے، جس کی حقیقت نہ کسی انسان کو معلوم ہوئی ہے نہ ہوگی، روح ایک ایسی شی ہے جس کی حقیقت کا علم صرف اللہ کو ہے۔ (تفسیر تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن ۱/۸۲۳)

قارئین کرام! انسان کے جسم میں روح کی موجودگی کی بہت سی علامتیں ہیں، مثلا جب تک انسان کے بدن میں روح موجود رہتی ہے انسان بولتا ہے، انسان ہنستا ہے، انسان کھیلتا ہے، انسان دوڑتا ہے اور انسان دنیا کے کام کاج کرتا ہے، لیکن جب یہ روح جسم سے نکل جاتی ہے تو انسانی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہوکر رہ جاتا ہے، انسان کسی بھی لائق نہیں رہ جاتا، نہ اپنے اوپر سے مکھی کو ہٹا سکتا ہے اور نہ ہی اپنے جسم سے گندگی کو دور کرسکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اسے چاہیے کہ الحمد لله کہے اور (سننے والا) اس کا بھائی یا اس کا ساتھی اس کے لئے یہ دعا کرے: يرحمك الله (اللہ تجھ پر رحم کرے)، پس جب وہ اس کو "يرحمك الله" کہے تو چھینکنے والا کہے: "يهديكم الله ويصلح بالكم" (اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے حال کی اصلاح فرمائے)۔ (صحیح بخاری کتاب الادب، ۱۲۶ باب إذا عطس كيف يشمّت، حدیث: ۶۲۲۴)

چونکہ جسم انسانی میں زندگی کی موجودگی کی سب سے بڑی علامت سانس ہے، جب کہ چھینک آتی ہے تو سانس ایک لمحہ کے لیے رک جاتی ہے، اگر وہ سانس رکی رہے تو آدمی مرجائے گا، اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ نے چھینکا آنے کے بعد شکر گزاری کے طور پر الحمد للہ کہنے کا حکم فرمایا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ: چھینک آنے سے انسان کا دماغ ہلکا ہوجاتا ہے اور جسم راحت محسوس کرتا ہے۔

فانی بدایونی سانس ہی کو زندگی سے تعبیر کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

ایک دوسرا شاعر موت اور زندگی کے فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

آدمی کا جسم کیا ہے جس پہ کرتا ہے گماں
خون کا گارا بنایا اینٹ اس میں ہڈیاں
بس خیالی چند سانسوں پہ کھڑا ہے یہ مکاں
موت کی پُر زور آندھی اس سے جب ٹکرائے گی
یہ عمارت ٹوٹ کر پھر خاک میں مل جائے گی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے یا تو وہ نیکوکار ہو تو شاید نیکیوں میں زیادہ بڑھ جائے یا بدکار ہو تو شاید توبہ کرلے۔ (متفق علیہ، صحیح بخاری، کتاب التمنی، باب ما یکرہ من التمنی، حدیث: ۷۲۳۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف کی وجہ سے جو اسے پہنچی ہو موت کی آرزو ہرگز نہ کرے اور اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اس طرح دعا کرے: اے اللہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو اور اس وقت مجھے فوت کردے جب وفات میرے لیے بہتر ہو۔ (متفق علیہ، کتاب الدعوات، باب الدعاء بالموت

والحیاۃ، صحیح بخاری، حدیث:۶۳۵۱)

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ انسان کو چونکہ مستقبل کا علم نہیں کہ آئندہ زندگی اس کے حق میں بہتر ہے یا نہیں، اس لئے مطلق کسی تکلیف اور مصیبت سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنا ایک تو بے صبری ہے، دوسرے اندھیرے میں تیر چلانا ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ جتنی زیادہ عمر اس کو ملے اتنی ہی نیکیوں میں ترقی کرے یا کسی گناہ میں مبتلا ہو تو شاید اس سے توبہ کرنے کا اسے موقع مل جائے، اس لیے موت کی آرزو کرنا منع ہے، البتہ شہادت یا کسی مقدس جگہ میں مرنے کی آرزو کرنا جائز ہے اور اگر ایسے ہی موت کی آرزو کرنی ہو تو حدیث میں مذکور الفاظ کے ساتھ دعا کی جائے۔ (ریاض الصالحین مترجم اردو:۱/۸۱)

(۲) (ب) انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسانی زندگی کے مقصد سے متعلق اللہ تعالی سورہ ملک میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ﴾ بہت بابرکت ہے وہ اللہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، جس نے موت اور حیات (زندگی) کو اس لیے پیدا کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے، سورہ مومنون میں ارشاد ربانی ہے: ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ، فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ﴾ یا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے ہی نہ جاؤ گے، اللہ تعالی سچا بادشاہ ہے، وہ بڑی بلندی والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی بزرگ عرش کا مالک ہے)۔

ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ میں نے جنات اور انسانوں کو محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ صرف میری عبادت کریں، نہ میں ان سے روزی چاہتا ہوں، نہ میری یہ چاہت ہے کہ مجھے کھلائیں، اللہ تعالی تو خود ہی سب کا روزی رساں اور زور آور ہے۔ (سورۃ الذاریات:۵۶، ۵۷، ۵۸)

سورہ دہر آیت نمبر۲ میں فرمان الٰہی ہے: ﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً، إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً﴾ بیشک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا ہے، تا کہ ہم اسے آزمائیں، پس ہم نے اسے خوب سننے والا اور اچھی طرح دیکھنے والا بنایا ہے، بیشک ہم نے راہ راست کی طرف اس کی رہنمائی کر دی ہے، چاہے تو شکر گزار بنے اور چاہے تو ناشکری کرے۔

مذکورہ آیات قرآنیہ سے واضح ہو گیا کہ یہ زندگی جو انسانوں کو تیس چالیس، پچاس یا ساٹھ سال کی دی گئی ہے، ایک ایسی زندگی کی تیاری کے لیے دی گئی ہے، جو زندگی کبھی ختم نہ ہوگی، جو زندگی کبھی زوال پذیر نہ ہوگی، جس زندگی میں کبھی موت نہیں آئے گی، جو زندگی یا تو انتہائی راحت کی، آرام کی، چین کی، سکون کی اور خوشی کی ہوگی یا انتہائی درد کی، تکلیف کی، مصیبت کی، رنج وغم کی اور الم کی ہوگی۔ ادھر جنتی جنت میں دودھ کی نہروں سے، شہد کی نہروں سے، شراب کی نہروں سے، جنت کے مسندوں پر، جنت کے بالا خانوں میں، جنت کی خوبصورت اور خوب سیرت عورتوں میں خوش وخرم ہو رہے ہوں گے۔ اور ادھر جہنمی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جل رہے ہوں گے، جہنم کے زہریلے سانپ اور بچھوان کو اپنا لقمہ بنا رہے ہوں گے، اور پیاس بجھانے کے لیے ایک قطرہ صاف اور ٹھنڈا پانی بھی ان کو میسر نہ ہوگا، یہ اسی زندگی کو کام میں لانے اور ضائع کرنے کا نتیجہ ہوگا، جو اس زندگی کو خالص اللہ کی عبادت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی سچی اتباع وپیروی کرتے ہوئے گزارے گا، وہ کامیاب ہو جائے گا، اور جو اس زندگی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے ہوئے ضائع وبرباد کر دے گا وہ ناکام ونامراد ہو جائے گا۔

﴿وَلَوْ تَرَى إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو رُؤُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحاً إِنَّا مُوقِنُونَ، وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، فَذُوقُوا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَاء يَوْمِكُمْ هَذَا إِنَّا نَسِيْنَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (سورہ السجدہ:۱۲،۱۳،۱۴)

اور کاش آپ وہ منظر دیکھ لیتے جب مجرمین اپنے رب کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے سب کچھ دیکھ لیا اور سن لیا، اس لیے اب ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے تا کہ نیک عمل کرلیں، اب ہمیں آخرت پر پورا یقین آ گیا ہے، اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت نصیب فرما دیتے، لیکن میری یہ بات بالکل حق ہو چکی ہے کہ میں ضرور بہ ضرور جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا، پس چکھو تم اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دینے کا مزہ۔ ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے اور اپنے کیے ہوئے اعمال کے سبب ہمیشہ باقی رہنے والے عذاب کا مزہ چکھتے رہو۔

ڈاکٹر لقمان السّلفی حفظہ اللہ مذکورہ آیات کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ: جب منکرین قیامت کے دن اپنے آپ کو میدان حشر میں اور واقعے کے روبرو پائیں گے، تو انتہائی ذلت ورسوائی کے سبب اپنے رب کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور عرق ندامت میں ڈوب جائیں گے کہ دنیا میں انکار آخرت، شرک باللہ اور دیگر گناہوں کا ارتکاب نہ کرتے تو آج یہ بُرا دن نہ دیکھنا پڑتا، پھر کہیں گے: اے ہمارے رب جن حقائق کو ہم دنیا میں جھٹلاتے تھے، اب ہم نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور جن باتوں کا ہم وہاں انکار کرتے تھے، اب ہم نے انہیں اپنے کانوں سے سن لیا، اب کوئی بات ہم سے پوشیدہ نہیں رہی، ہمیں ساری باتوں کا یقین ہو گیا ہے، اس لیے تو ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دے تا کہ ہم تلافی مافات کرلیں اور عمل صالح کر کے اپنی آخرت سدھار لیں تو اللہ رب العالمین جواب میں فرمائے گا، میں نے تو دنیا میں خیر وشر کے دونوں راستے بتا کر انسانوں کو اختیار دے دیا تھا، تا کہ جو چاہے جنت کی راہ اختیار کرے اور جو چاہے جہنم کی راہ پر چلے، اور تم نے اپنی مرضی سے جہنم کی راہ اختیار کر لی، اب تمام حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں، اگر ایسا ایمان میرے نزدیک قابل قبول ہوتا تو میں اپنی مرضی سے تمام انسانوں کو راہ ہدایت پر لا کھڑا کر دیتا، میرے نزدیک اعتبار اس ایمان کا ہے جسے بندہ اپنی مرضی سے دنیاوی زندگی میں اختیار کرتا ہے، جو جن وانس دنیا میں اپنی مرضی سے ایمان نہیں لائیں گے، ان سے میں جہنم بھر دوں گا۔ (تفسیر تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن ۲/۱۱۶۷)

ایک مثال: دنیا کے کاموں میں مصروف اور آخرت کو بھول جانے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے آدمیوں کی ایک جماعت ایک کشتی میں سوار ہو اور کشتی کسی جزیرہ میں پھنس جائے، وہ جماعت حاجت انسانی اور طہارت جسمانی کے لئے کشتی سے باہر آ جائے، اور ملاح منادی کر دے کہ کوئی زیادہ دیر نہیں لگائے، طہارت کے سوا کسی اور کام میں مشغول نہ ہو جائے، کیونکہ کشتی جلد روانہ ہو جائے گی، کسی کا انتظار نہیں کیا جائے گا، اور یہ لوگ اس جزیرہ میں جا کر بکھر جاگئے، ایک گروہ بڑا عقلمند تھا، اس نے جلدی سے طہارت حاصل کی اور واپس آ گیا، کشتی خالی تھی جو جگہ اپنے لیے مناسب تھی لے لی، اور ایک گروہ اس جزیرہ کے عجائبات دیکھنے کی غرض سے ٹھہر گیا، وہاں خوش رنگ پھول، خوش آواز جانور، خوبصورت سنگریزے اور رنگ برنگی چیزیں دیکھنے میں مشغول ہو گیا، جب لوٹ کر آیا تو کشتی میں حسب منشا جگہ نہ پائی، تنگ وتاریک جگہ میں بیٹھنا پڑا اور تکلیف اٹھائی اور ایک گروہ نے عجائبات دیکھنے پر بھی اکتفا نہ کیا بلکہ وہاں سے عمدہ عمدہ سنگریزے چن لیے، اور کشتی میں ان کے رکھنے کی جگہ نہ پائی تو خود تنگ جگہ میں بیٹھ گیا اور سنگریزوں کو اپنی گردن پر رکھ لیا، جب دو دن گزرے سنگریزوں کا عمدہ رنگ بدل کر سیاہ ہو گیا اور بدبو آنے لگی تو ان بدبودار سنگریزوں کو پھینکنے کی جگہ بھی نہ ملی، وہ گروہ پشیمان

ہوا، اوراس بوجھ اور تکلیف کو اپنی گردن پر رکھ لیا، اور ایک گروہ اس جزیرے کے عجائبات دیکھ کر ایسا متحیر ہوا کہ انہیں دیکھتا ہی رہا اور کشتی چل نکلی، ملاح کا کہنا نہ سنا، اسی جزیرے میں پڑا رہا، یہاں تک کہ اس گروہ کے بعض آدمی بھوک سے مر گئے اور بعض کو درندوں نے ہلاک کر ڈالا، پہلا عقلمند گروہ مسلمانوں کے مثل ہے اور چوتھا گروہ جو بالکل ہلاک ہو گیا کافروں کے مانند ہے کہ توحید و آخرت کو بھول کر اپنے کو بالکل دنیا کے حوالے کر دیا، اور بیچ والے دوسرے اور تیسرے دونوں گروہ گنہ گاروں کی طرح ہیں کہ اصل ایمان محفوظ رہا لیکن دنیا سے ہاتھ نہ کھینچا، ایک گروہ نے درویشی کے ساتھ سیر کی حظ اٹھایا اور ایک نے سیہ کاری کی اور سنگریزے لاد کر اپنے آپ کو تکلیف اور مشقت میں ڈالا۔ (کیمیائے سعادت امام غزالیؒ ص:۹۵)

(۲) موت کس کو آئے گی؟ ارشاد ربانی ہے: ﴿كل نفس ذائقة الموت وانما توفون أجوركم يوم القيامة، فمن زحزح عن النار و أدخل الجنة فقد فاز، وما الحياة الدنيا الا متاع الغرور﴾ (سورہ آل عمران:۵۸۵)

ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے اور قیامت کے دن تم اپنے بدلے پورے پورے دیے جاؤ گے، پس جو شخص آگ سے ہٹا دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، بیشک وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو صرف دھوکے کا سامان ہے۔

اس آیت میں ایک تو اس اٹل حقیقت کا بیان ہے کہ موت سے کسی کو مفر نہیں، دوسرا یہ کہ دنیا میں جس نے اچھا یا برا جو کچھ کیا ہوگا، اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، تیسرا کامیابی کا معیار بتلایا گیا ہے کہ کامیاب اصل میں وہ ہے جس نے دنیا میں رہ کر اپنے رب کو راضی کر لیا، جس کے نتیجے میں وہ جہنم سے دور اور جنت میں داخل کر دیا گیا، چوتھا یہ کہ دنیا کی زندگی سامان فریب ہے جو اس سے دامن بچا کر نکل گیا وہ خوش نصیب اور جو اس کے فریب میں پھنس گیا وہ ناکام و نامراد ہے۔ (تفسیر احسن البیان ص:۱۹۴)

قارئین کرام! موت سے کسی کو بھی چھٹکارا نہیں ہے، موت سے کسی کو بھی نجات نہیں ہے۔

اللہ رب العالمین نے محمد رسول اللہ ﷺ کی موت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وما محمد إلا رسول قد خلت من قبله الرسل أفإن مات أو قتل انقلبتم على أعقابكم ومن ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئا وسيجزى الله الشاكرين﴾ (آل عمران:۱۴۴)

محمد رسول اللہ ﷺ صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، تو کیا ان کا انتقال ہو جائے یا وہ شہید کر دیے جائیں تو تم اسلام سے الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے گا تو اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، عنقریب اللہ تعالی شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔ (ترجمہ جونا گڈھیؒ)

میدان احد میں مسلمانوں کی شکست بھی ہوئی اور ان میں سے بعض شہید بھی کیے گیے، اس دن شیطان نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ محمد ﷺ شہید ہو گیے، عبد اللہ بن قمیہ نے مشرکوں میں جا کر یہ خبر اڑا دی کہ میں نبی ﷺ کو قتل کر کے آیا ہوں، دراصل وہ افواہ بھی بالکل بے اصل تھی، اور اس شخص کا یہ قول بھی بالکل غلط تھا، اس نے نبی ﷺ پر حملہ تو کیا تھا، لیکن اس سے صرف آپ ﷺ کا چہرہ قدرے زخمی ہو گیا تھا، اور کوئی بات نہ تھی، اس غلط بات کی شہرت نے مسلمانوں کے دل چھوٹے کر دیے جس سے ان کے دل اکھڑ گئے اور لڑائی سے بددل ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے، اسی بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ اگلے انبیاء کی طرح یہ بھی ایک نبی ہی ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ میدان جنگ میں قتل کر دیے جائیں لیکن ان کے قتل سے اللہ کا دین جاتا نہیں رہے گا۔ (تفسیر ابن کثیر اردو:۱/۴۴۴)

سرور دو جہاں رحمت للعالمین سید الانبیاء شافع محشر اللہ کے حبیب محمد ﷺ کو جب موت نے نہیں چھوڑا تو ہماری کیا حقیقت ہے؟ حضرت عیسی علیہ السلام کے علاوہ دنیا میں تمام پیغمبروں کو موت آ چکی ہے، حضرت عیسی علیہ السلام کو اللہ تعالی نے زندہ آسمان پر اٹھا لیا ہے

جو قیامت کے قریب نزول فرمائیں گے اور موت ان کو بھی نہیں چھوڑے گی، سورہ مریم میں اللہ تعالی نے عیسی علیہ السلام کی موت کا تذکرہ انہیں کی زبانی فرمایا ہے: ﴿والسلام علي يوم وُلدت ويوم أموت ويوم أبعث حيا﴾ (سورہ مریم:۳۳-۳۴) مجھ پر اللہ کی سلامتی رہی جس دن میں پیدا ہوا اور اس دن بھی رہے گی جب دن میں مروں گا اور جب دوبارہ اٹھایا جاؤں گا، عیسی بن مریم کی یہی حقیقت ہے، یہی وہ حق بات ہے جس میں تم لوگ اختلاف کرتے رہے ہو۔

(۳) موت کب آئے گی؟ ارشاد ربانی ہے: ﴿لكل أمة أجل فإذا جاء أجلهم لا يستأخرون ساعة ولا يستقدمون﴾ (الاعراف:۳۵) ہر گروہ کے لیے ایک میعاد معین ہے، سو جس وقت ان کی میعاد معین آجائے گی، اس وقت نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے سرک سکیں گے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے: ﴿ولن يؤخر الله نفسا إذا جاء أجلها والله خبير بما تعملون﴾ (سورۃ المنافقون:۱۱) اور جب کسی کا مقررہ وقت آجاتا ہے پھر اسے اللہ تعالی ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ تعالی بخوبی باخبر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا کندھا پکڑا اور فرمایا: تم دنیا میں اس طرح رہو گویا تم ایک پردیسی یا راہگیر ہو اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما فرمایا کرتے تھے کہ جب شام کرو تو صبح کا انتظار مت کرو اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار مت کرو۔ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، حدیث:۶۴۱۶)

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو شخص دنیا کو ایک مسافر خانہ اور گزرگاہ سمجھے گا، وہ یقیناً دنیا کی رنگینیوں سے اپنا دامن الجھانا پسند نہیں کرے گا، انسان کی غلطی یہی ہے کہ وہ دنیا کی اس حیثیت کو نہیں سمجھتا اور پل کی خبر نہ ہونے کے باوجود سو برس کے سامان کی تیاری میں لگا رہتا ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں (ریاض الصالحین مترجم:۱/۴۲۶)

قارئین کرام! یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ موت کا معین وقت اللہ تعالی کے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں ہے، موت بڑھاپے میں بھی آجاتی ہے، موت جوانی میں بھی آجاتی ہے، موت بچپنے میں بھی آجاتی ہے، موت نماز کی حالت میں بھی آجاتی ہے، موت سجدے کی حالت میں بھی آجاتی ہے، موت گناہ کرنے کی حالت میں بھی آجاتی ہے، اس لئے ہر انسان کو ہر وقت موت کی تیاری میں لگا رہنا چاہیے، مگر اس کے برخلاف آدمی وعدہ کرتا ہے کہ ہم نماز اس وقت پڑھیں گے جب ہماری شادی ہو جائے گی، جب ہم ابو بن جائیں گے، جب ہم دادا اور نانا بن جائیں گے، لیکن وہی نوجوان جس نے اتنی بڑی بڑی ڈینگیں ماری تھیں، چند مہینے کے بعد کسی دردناک حادثے میں موت کا کڑوا جام پی کر دنیا ہی سے کوچ کر گیا اور ساری کی ساری آرزوئیں شادی بیاہ کی، دادا، نانا بننے کی ایک پل میں ختم ہو گئیں۔

آدمی وعدہ کرتا ہے اگلے جمعہ سے نماز شروع کر دیں گے پھر کبھی بھی نماز نہیں چھوڑیں گے، ابھی جمعہ کا دن ختم ہوا، سنیچر کی رات میں قدم رکھا اور اتوار آنے نہیں پایا کہ آدمی کو موت نے اچانک آ پکڑا، دور حاضر میں عجیب عجیب قسم کی بیماریاں چلی ہیں کہ آدمی منٹوں سکنڈوں ختم ہو جاتا ہے۔

گر جوانی میں عبادت کا ہلی اچھی نہیں جب بڑھاپا آ گیا توبات بن سکتی نہیں

(۴) موت کہاں آئے گی؟ ارشاد ربانی ہے: ﴿وما تدري نفس ماذا تكسب غدا وما تدري نفس بأي أرض تموت﴾ (سورہ لقمان:۳۴) کوئی بھی نہیں جانتا کہ کل کیا کچھ کرے گا، نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بیشک اللہ تعالی ہی پورے علم والا اور صحیح خبروں والا ہے۔

دوسرے مقام پر فرمان الٰہی ہے: ﴿أينما تكونوا يدرككم الموت ولو كنتم في بروج مشيدة﴾ (سورۃ النساء: ۷۸) تمام جہاں کہیں بھی ہو موت تمہیں آ پکڑے گی، گو تم مضبوط قلعوں میں ہو۔

انسان کل کیا کرے گا وہ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا کسی کو آنے والے کل کے بارے میں علم نہیں کہ وہ اس کی زندگی میں آئے گا یا نہیں اور اگر آئے گا تو وہ اس میں کیا کچھ کرے گا۔ موت کہاں آئے گی؟ گھر میں یا گھر سے باہر اپنے وطن میں یا دیارِ غیر میں، جوانی میں آئے گی یا بڑھاپے میں، اپنی آرزوؤں اور خواہشات کی تکمیل کے بعد آئے گی یا اس سے پہلے؟ کسی کو معلوم نہیں۔ (تفسیر احسن البیان ص: ۱۱۵۴)

قارئین کرام! آدمی وطن میں بھی مرجاتا ہے، آدمی پردیس میں بھی مرجاتا ہے، آدمی گھر میں بھی مرجاتا ہے، آدمی دوکان میں بھی مرجاتا ہے، کوئی کھیت میں مرجاتا ہے، کوئی دریا میں مرجاتا ہے، کوئی سمندر میں مرجاتا ہے، کوئی جنگل میں مرجاتا ہے، کوئی فائیو اسٹار ہوٹل میں مرجاتا ہے، کوئی شیش محل میں مرجاتا ہے، کوئی ہسپتال میں مرجاتا ہے، کوئی ایمبولینس میں مرجاتا ہے، کوئی فلم ہال میں فلم دیکھتے دیکھتے مرجاتا ہے، کوئی ماروتی اور موٹر سائیل پر تیز رفتاری کی شان دکھاتے ہوئے مرجاتا ہے، کوئی گندے وفحش گانے گاتے گاتے مرجاتا ہے، کوئی موبائل اور انٹرنیٹ پر گندی فلمیں وتصویریں دیکھتے مرجاتا ہے، مگر اس کے باوجود بھی موت کا ذرہ برابر بھی خوف ہمارے دلوں کے اندر موجود نہیں ہے۔

گھر سے نکلو تو پتہ جیب میں رکھ کے نکلو حادثے چہرے کی پہچان مٹا دیتے ہیں

لاکھوں کروڑوں کا مالک ٹرین میں سوار ہے اور ٹرین میں حادثے کا شکار ہوگیا، دھکم پیل میں نیچے گر گیا، ایسی جگہ گرا جہاں کوئی آبادی نہیں ہے، جہاں سے کسی کا گزر ہونے والا نہیں ہے، لاکھوں کروڑوں کا مالک خاک وخون میں لت پت بے یار ومددگار پڑا ہوا ہے، اسے کتے بھی نوچ رہے ہیں، گدھ بھی نوچ رہے ہیں، چیل اور کوے بھی اس کو اپنا لقمہ بنا رہے ہیں، جنازے کی نماز کون کہے کفن بھی نصیب نہیں ہے، قبر کا گڑھا بھی نصیب نہیں ہے۔

آجاتی ہے واں موت جہاں گھر نہیں ہوتا بہتوں کو کفن تک بھی میسر نہیں ہوتا

(۵) موت کیسے آئے گی؟ موت کی دو قسمیں ہیں: (۱) مومنوں کی موت (۲) کافروں کی موت۔ لیکن قرآن کریم اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ موت کے وقت کافروں کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ مومنوں کو نہیں ہوتی، مومنوں کی بہ نسبت کافروں کو موت کے وقت زیادہ تکلیف ہوتی ہے، ارشاد ربانی ہے: ﴿والنازعات غرقا، والناشطات نشطا﴾ (سورۃ النازعات: ۱-۲) ڈوب کر سختی سے کھینچنے والوں کی قسم! بندھول کر چھڑا دینے والوں کی قسم۔

مذکورہ آیتوں میں بتلایا گیا کہ فرشتے کافروں کی روح نہایت سختی سے جسم کے اندر ڈوب کر نکالتے ہیں، اور مومنوں کی روح آسانی سے نکالتے ہیں، جیسے کسی چیز کی گرہ کھول دی جائے۔ (تفسیر احسن البیان ص: ۱۶۷۸)

کافروں کی موت کا منظر: کافروں کی موت کا منظر بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ولو ترى اذ الظالمون في غمرات الموت والملائكة باسطوا أيديهم أخرجوا أنفسكم اليوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تقولون على الله غير الحق وكنتم عن آياته تستكبرون، لقد جئتمونا فرادى كما خلقناكم أول مرة، وتركتم ما خولناكم وراء ظهوركم وما نرى معكم شفعاء كم الذين زعمتم أنهم فيكم شركاء لقد تقطع بينكم وضل عنكم ما كنتم تزعمون﴾ (سورۃ الانعام: ۹۳-۹۴)

اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جبکہ یہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ ہاں

اپنی جان کو نکالو، آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس سبب سے کہ تم اللہ کے ذمہ جھوٹی باتیں لگاتے تھے، اور تم اللہ تعالی کی آیات سے تکبر کرتے تھے، اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آ گئے، جس طرح ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا، اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے ہو اور ہم تو تمہارے ہمراہ تمہارے ان شفاعت کرنے والوں کو نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تمہارا دعوی تھا کہ وہ تمہارے معاملہ میں اللہ کے شریک ہیں، واقعی تمہارے آپس کے رشتے ٹوٹ گئے اور تمہارا خیال بالکل غلط نکلا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے: ﴿ولو ترى اذ يتوفى الذين كفروا الملائكة يضربون وجوههم وأدبارهم﴾ اور اگر آپ وہ منظر دیکھ لیں تو تعجب کریں گے، جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، ان کے چہروں پر اور ان کی سرینوں پر مار مارتے ہیں اور کہتے ہیں اب آگ کا عذاب چکھو۔

یہ آیت کریمہ عام ہے جو ہر کافر و مشرک کو شامل ہے اور مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت فرشتے ان کے مونہوں اور سرینوں پر مارتے ہیں۔ (تفسیر احسن البیان ص:۴۹۴)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابوسلمہ ؓ کے پاس حاضر ہوئے جبکہ (روح نکلنے کے بعد) ان کی آنکھیں اوپر کھلی ہوئی تھیں تو آپ ﷺ نے ان کی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کردی، پھر فرمایا: بے شک روح جب نکالی جاتی ہے تو آنکھیں اس کے پیچھے لگتی ہیں، پس ان کے گھر والوں میں سے کچھ لوگ چیخ کر رونے لگے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم اپنی جانوں کے لئے بھلائی ہی کی دعا کرو، اس لئے کہ جو تم کہتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔ (کتاب الجنائز، باب اغماض المیت والدعاء لہ اذ حضر، صحیح مسلم)

چونکہ دنیاوی زندگی میں روح اور بدن ایک لمحہ کے لئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، اس لئے ان دونوں میں بہت گہری محبت پیدا ہوتی ہے، موت کے وقت جب روح بدن سے جدا ہوتی ہے تو آنکھیں انتہائی حسرت سے روح کا پیچھا کرتی ہیں کہ ہائے افسوس! آج یہ روح ہم سے جدا ہو کر کہاں جا رہی ہے، ہائے افسوس! اب اس بدن کا کون خیال رکھے گا، ہائے افسوس! اس روح کے جدا ہونے کے بعد اس بدن کو گل سڑ کر مٹی میں مل جانا پڑے گا۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿فلولا إذا بلغت الحلقوم وأنتم حينئذ تنظرون ونحن أقرب إليه منكم ولكن لا تبصرون، فلولا ان كنتم غير مدينين ترجعونها إن كنتم صادقين﴾ (سورہ واقعہ:۸۳-۸۶)

جب کسی کی روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت اسے (مجبور محض بن کر) دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم بہ نسبت تمہارے اس شخص سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، لیکن تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور اگر تم کسی کے تابع فرمان نہیں ہو اور اس دعوی میں سچے ہو تو اس کی روح کو واپس کیوں نہیں لے آتے۔

مذکورہ آیات قرآنیہ کی تفسیر کرتے ہوئے ڈاکٹر لقمان السلفی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب فرشتے کسی انسان کی جان نکالتے ہیں اور اس کی روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور نکلنے ہی والی ہوتی ہے، اس وقت وہ اور اسکے سارے اقارب و احباب اس کے اردگرد کتنے مجبور ہوتے ہیں کہ اس کی روح نکل رہی ہوتی ہے اور وہ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا ہوتا ہے، اور سب لوگ اس کے حال پر رحم کھا رہے ہوتے ہیں، لیکن کوئی اس کی مدد نہیں کرسکتا کہ اس کی روح کو اس کے جسم میں لوٹا دے، اس وقت اللہ کے فرشتے مرنے والے سے اس کے رشتہ داروں کی بہ نسبت زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن لوگ ان فرشتوں کو دیکھ نہیں پاتے، یا مرنے والا جو کچھ اس وقت جھیل رہا ہوتا ہے، اس راز سربستہ سے لوگ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ (تفسیر تیسیر الرحمن لبیان القرآن ۲/۱۵۳۱)

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالی عنہ اپنی زندگی میں کہا کرتے تھے کہ مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جن کے موت کے وقت ہوش و حواس درست ہوتے ہیں، مگر موت کی حقیقت بیان نہیں کرتے، لوگوں کو یہ بات یاد تھی جب وہ خود اس منزل پر پہنچے تو

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں یہ مقولہ یاد دلایا، ایک روایت میں ہے کہ خود ان کے بیٹے نے سوال کیا تھا، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ٹھنڈی سانس لی اور جواب دیا: جان من! موت کی صفت بیان نہیں ہوسکتی، موت نا قابل بیان ہے، لیکن میں اس وقت صرف ایک اشارہ کرسکتا ہوں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان زمین پر ٹوٹ کر گر پڑا ہے اور میں دونوں کے درمیان پڑ گیا ہوں، گویا میری گردن پر رضوی پہاڑ رکھا ہوا ہے، گویا میرے پیٹ میں کھجور کے کانٹے بھر گئے ہیں، گویا میری سانس سوئی کے ناکے سے نکل رہی۔ (انسانیت موت کے دروازے پر، ص: ۱۱۰)

حجاج بن یوسف کے سکرات موت کے وقت حضرت حسن بصریؒ عیادت کو آئے تو حجاج نے ان سے اپنی تکلیفوں کا شکوہ کیا، حضرت حسن بصریؒ نے کہا کیا میں تجھے منع نہیں کرتا تھا کہ نیکوکاروں کو نہ ستا، مگر افسوس تم نے نہیں سنا۔

حجاج نے خفا ہوکر جواب دیا: میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ اس مصیبت کے دور کرنے کی دعا کر، میں تجھ سے یہ دعا چاہتا ہوں کہ اللہ میری روح جلد قبض کرلے اور اب زیادہ عذاب نہ دے، اسی درمیان ابومنذر یعلی بن مخلی مزاج پرسی کو پہنچے اور سوال کیا: حجاج موت کے سکرات اور سختیوں میں تیرا کیا حال ہے؟ اے یعلی! حجاج نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا کیا پوچھتے ہو؟ ''شدید مصیبت، سخت تکلیف، نا قابل بیان الم، نا قابل برداشت درد، سفر دراز توشہ قلیل، آہ میری ہلاکت! آہ میری ہلاکت! اگر اس جبار وقہار نے مجھ پر رحم نہ کھایا''۔ (انسانیت موت کے دروازے پر ص: ۱۱۸)

عربی ادب کے مشہور امام جاحظ کا جب وقت آخر ہوا تو ابوالعباس المبرد عیادت کو گئے، مزاج پرسی کے جواب میں جاحظ نے کہا: وہ شخص کیسا ہوگا جس کا آدھا دھڑ اتنا سن ہوگیا ہو کہ اگر آرے چیر دیا جائے تو بھی اسے پتہ نہ چلے، اور آدھا دھڑ اتنا حساس ہوگیا کہ اگر مکھی بھی اس کے اوپر سے پرواز کرتے تو درد محسوس کرنے لگے۔ (انسانیت موت کے دروازے پر ص ۱۵۸)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرمایا کرتی تھیں کہ اللہ کی بہت سی نعمتوں میں سے ایک نعمت مجھ پر یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات میرے گھر میں اور میری باری کے دن ہوئی، آپ اس وقت میرے سینے سے ٹیک لگائے ہوئے تھے اور یہ کہ اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت میرے اور آپ کے تھوک کو ایک ساتھ جمع کردیا تھا، ہوا یوں کہ عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما گھر میں آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی، رسول اللہ ﷺ مجھ پر ٹیک لگائے ہوئے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ اسی مسواک کو دیکھ رہے ہیں، میں سمجھ گئی کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں، اس لئے میں نے آپ سے پوچھا یہ مسواک آپ کے لئے لے لوں؟ آپ نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا، میں نے وہ مسواک ان سے لے لی، مگر رسول اللہ ﷺ اسے چبا نہ سکے، میں نے پوچھا آپ کے لئے اسے نرم کردوں، آپ نے سر کے اشارے سے فرمایا: ہاں، میں نے مسواک نرم کردی، آپ کے سامنے چمڑے یا لکڑی کا بڑا پیالہ تھا، جس کے اندر پانی تھا، رسول اللہ ﷺ بار بار اپنے دونوں ہاتھوں کو اس پیالے کے اندر داخل کرتے اور پھر انہیں اپنے چہرے پر پھیرتے اور فرماتے: لا الہ الا اللہ، موت کے وقت شدت ہوتی ہے اور پھر اپنا ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے، فی الرفیق الأعلی، یہاں تک کہ آپ رحلت فرما گئے اور آپ کا ہاتھ جھک گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (صحیح بخاری مترجم از داود راز: ۶/ ۵۳، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ، حدیث: ۴۴۴۹)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ موت کی سختیوں سے کوئی بھی انسان نہیں بچ سکتا، اگر موت کی سختیوں سے بچنے والی کوئی ذات ہوتی تو وہ امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہوتی۔

آخر میں دعا ہے کہ اے اللہ ہمارے دلوں میں فکر آخرت پیدا فرما اور ایمان کے ساتھ موت نصیب فرما۔

☆☆☆

حصول علم دین کا مقصد اور طلبہ

محمد فرقان معین الحق سلفی

علم کا نام سامنے آتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی چمک اٹھی ہو، کیونکہ یہ علم ہی ہے جو انسان کو اس کے مقصد زندگی اور حیات حقیقی سے آگاہ کرتا ہے، ہر نیک و بد اور مفید و مضر کی پہچان کراتا ہے اور اسے حیوانوں کی سطح سے بلند کر کے انسانیت کی سطح تک پہنچاتا ہے، اسی سے افراد اور قومیں آگے بڑھتی ہیں اور شارع علیہ السلام انسانیت کو جس راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں ان کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور اللہ رب العالمین جس مقصد کے تحت بنی نوع انسان کو وجود بخشا ہے اس کا حصول بھی علم ہی پر منحصر ہے، تاریخ شاہد عدل ہے کہ جن لوگوں نے دین حق کو سیکھا اور اس کو پھیلانے میں لگے رہے وہی کامیاب ہوئے اور تاریخ نے انہیں کو زندہ رکھا، اسی بات کی طرف اللہ تعالی نے سورہ علق میں یوں اشارہ کیا ہے: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ کہ پڑھنے کی ابتدا اس پروردگار کے نام سے کرنی چاہئے جس نے انسان کو علق سے پیدا فرمایا ہے۔

پڑھنا اور علم دین حاصل کرنا بس اللہ رب العالمین کے نام سے ہونا چاہئے، نفس کی خواہش اور کسی بھی قسم کے غلط مقصد کے لیے نہیں، انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ اسے کسی ایسے مقصد کے لیے استعمال کرے جو حق سے ٹکراتا ہو۔(۱) لیکن افسوس آج جبکہ علم دین کو رضائے الہی کے لیے ہونا چاہئے تھا کسب معاش کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے اور مقصد اشاعت دین و اصلاح امت کو بھی فراموش کر دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایسے لوگوں کے بارے میں وعید سناتے ہوئے فرمایا: "من تعلم علما مما يبتغى به وجه الله لا يتعلمه الا ليصيب به عرضا من الدنيا لم يجد عرفا من الجنة" (۲) کہ جس نے کوئی ایسا علم حاصل کیا جس کے ذریعہ اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے اور وہ دنیا کے فائدہ کے مقصد سے اسے سیکھتا ہے تو قیامت کے دن وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پا سکے گا۔

علامہ یوسف قرضاوی فرماتے ہیں: جو دین اور علم دین کی تعلیم کے کسی ایسے مرکز میں پہنچ جائے اسے چاہئے کہ از سر نو صحیح نیت اور سچی خواہش پیدا کرے، قرآن و سنت کے علم اور بھلے لوگوں کے زیر سایہ رہنے سے نیت کی درستی اور اللہ تعالی کے لیے یکسوئی پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔(۳) ایک دوسری روایت میں یوں وعید ہے: "لا تعلموا العلم لتباهوا به العلماء أو لتماروا به السفهاء ولا تخيروا به المجالس فمن فعل ذلك فالنار النار" (۴) یعنی علم اس لیے نہ سیکھو کہ علماء پر فخر کرو یا بیوقوفوں پر بڑائی جتلاؤ اور نہ ہی اس کی وجہ سے مجلس میں ممتاز جگہ بیٹھنے کی کوشش کرو جو ایسا کرے گا اس کے لیے جہنم ہی ہے۔

(۱) تعلیم کی اہمیت ص ۱۱۔ (۲) اخرجہ ابوداود: ۳۶۶۴، وحسنہ الالبانی۔
(۳) تعلیم کی اہمیت، ص: ۱۱۸۔ (۴) اخرجہ ابن ماجہ: ۲۵۹، وصححہ الالبانی۔

ابن ماجہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ جس کا مقصد آخرت ہو اللہ تعالی اس کا شیرازہ جمع کر دے گا اور تونگری اس کے دل میں پیدا کر دے گا اور دنیا اس کے پاس مجبور ہو کر آئے گی۔(۱)

علم دین کا حاصل کرنا کار خیر ہے اس کا حصول جہد مسلسل کے ذریعہ ہی ممکن ہے، علم دین حاصل کرنے والے طلبہ پر لازم ہے کہ نہایت خلوص وللّٰہیت کے ساتھ یکسو ہو کر اپنی منزل کے پا لینے میں لگے رہیں اور دنیاوی خواہشات کی طرف توجہ نہ دیں، ہم یہ نہ دیکھیں کہ ہمارے کھانے پینے رہنے سہنے کا کیا انتظام ہے بلکہ تکلفات سے الگ ہو کر اپنے اسلاف کی زندگی کی روشنی میں علم دین حاصل کریں، انسان کی سرخ روئی اسی وقت ممکن ہے جب اس کے پاس علم دین ہو، ہم طلبہ ایک ایسی راہ پر ہیں جن میں دین و دنیا کی سعادتیں ہیں، لہذا ہم طلبہ پوری محنت ولگن کے ساتھ تعلیم حاصل کریں تا کہ مستقبل میں ہم معمار قوم ہوں، لیکن حصول علم کا مقصد اولی عمل ہے اور بنا عمل کے علم کی کوئی قیمت نہیں اور اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں، اللہ رب العالمین نے سورہ صف میں فرمایا: اے مومنو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے تم خود کرتے نہیں، اور بنی اسرائیل پر نکیر کرتے ہوئے فرمایا: "أتامرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم" (۲) کہ کیا تم لوگوں کو نیکی کرنے کا حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھلا دیتے ہو، اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ میں تیرے ذریعہ اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع بخش نہ ہو۔(۳)

ابو قلابہ فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالی تمہیں علم سے نوازے تو تم اس کی عبادت کرو یعنی علم پر عمل کرو، ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اعمل بعلمك تغتنم أيها الرجل لا ينفع العلم ان لم يحسن العمل (۴)

یعنی اے آدمی تو اپنے علم پر عمل کر فائدہ میں رہے گا، اگر عمل درست نہ ہوں تو علم بیکار و بے فائدہ ہے۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ کا قول ہے، کہا جاتا ہے کہ ایسے علماء کے لیے تباہی ہے جو عبادت کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقصد کے لیے دین میں فقاہت حاصل کرتے ہیں۔(۵)

جو علم دنیا کمانے کے لیے حاصل کیا جاتا ہے وہ علم اس کے قلب میں جگہ نہیں پاتا ہے۔

ان تمام اقوال میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو علم دین کے حصول کا مقصد دنیا کو بناتے ہیں، یا علم دین کے زیور سے آراستہ تو ہیں مگر حسن عمل کی دولت سے محروم ہیں۔

علم دین کے طلبہ کا مقصد اور غرض اول یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنی نیت درست کرے، اخلاص وللّٰہیت اور یکسوئی پیدا کرے اور علم دین کے حصول کا مقصد طلب آخرت اور اللہ تعالی کی خوشنودی کا حصول بنائے یہ نیت نہ رکھے کہ اس کے ذریعہ علماء سے مسابقت کرے یا بیوقوفوں پر برتری جمائے یا مالداروں کا ساتھ پکڑے یا امراء و حکام کی قربت حاصل کرے۔

اللہ تعالی ہم سب کو اس کی توفیق بخشے، آمین۔

☆☆☆

(۱) ایضا: ۲۶۰، وصححہ الالبانی ایضا۔ (۲) سورہ بقرہ: ۴۴۔

(۳) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب الأدعیۃ۔ (۴) ماخوذ از علم ایک شرعی ضرورت ص ۶۱ تا ۶۵۔ (۵) ایضا۔

عالم اسلام

ظل الرحمٰن سلفی
سنٹرل لائبریری جامعہ سلفیہ

فرانس میں نقاب پر پابندی

پیرس-۱۳/ جولائی فرانس میں برقع پر پابندی عائد ہوگئی۔فرانس کے ایوان زیریں میں پورے ملک میں برقع پر پابندی سے متعلق بل پر ووٹنگ ہوگئی۔بل کی حمایت میں ۳۳۶ سینٹروں نے اور بل کے خلاف ایک سینٹر نے ووٹ دیا۔ایوان زیریں میں برقع پر پابندی سے متعلق بل کے ایک مقابلہ میں ۳۳۶ سے منظور ہونے سے پورے ملک برقع پر پابندی کا راستہ صاف ہوگیا۔حالانکہ جمہوری طریقۂ عمل کے ذریعہ ابھی اس بل کو ایوان بالا میں پیش ہونا باقی ہے۔اس کے بعد مذکورہ منظور شدہ بل صدر فرانس کوزی کے پاس بھیجا جائے گا۔ (بحوالہ آواز ملک بنارس،۱۴/ جولائی ۲۰۱۰ء ص:۱)

حکومت سعودیہ کا میت کی تدفین سے متعلق ایک اہم فیصلہ

سعودی عرب کی وزارت خارجہ نے ایک سرکلر جاری کرتے ہوئے تمام سعودی وغیر سعودی مسلمانوں سے کہا ہے کہ جہاں کہیں کسی کا انتقال ہو اسی جگہ تدفین کی جائے۔کیونکہ شرعا بھی موت جہاں پر واقع ہو، بلا تاخیر تدفین بھی وہیں عمل میں لائی جائے تاکہ نعش میں تعفن نہ پیدا ہو۔

سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم شیخ عبدالعزیز الشیخ نے کہا کہ قرآن میں اس بات کی اہمیت نہیں کہ مکہ یا مدینہ میں دفن ہونا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ان مقامات پر دفن ہونے سے گناہوں کی بخشش ہونا ضروری نہیں بلکہ مغفرت کا واحد ذریعہ اعمال صالحہ ہیں۔حکومت کے اس فیصلے کا وہاں کے علماء کرام نے خیر مقدم کیا ہے۔ (ماہنامہ معارف،اعظم گڈھ، جون ۲۰۱۰ء)

اسلامی قوانین کے ذریعہ ماحولیاتی خطرات سے بچا جاسکتا ہے

برطانوی شہزادہ چارلس کا بیان

نیویارک،۱۱/ جون (ایجنسیاں) اسلامی قوانین پر عمل کرکے دنیا کو ماحولیاتی خطرات سے بچایا جاسکتا ہے۔یہ بات شہزادہ چارلس نے ایک بین الاقوامی ماحولیاتی کانفرنس کے دوران ماہرین ماحولیات سے اپنے خطاب میں کہی۔

نیویارک میں ہونے والی اس کانفرنس میں برطانوی شہزادے نے گلوبل وارننگ کے باعث ہونے والی تبدیلیوں اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹنے کے لئے عالمی ماہرین پر زور دیا ہے کہ قرآن میں بتائے گئے احکامات پر عمل کرکے دنیا کو کسی بڑے نقصان سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے،اس موقع پر کئی مسلمان طلبہ بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ ۲۸/ جون ۲۰۱۰ء ص:۱۲)

اخبار جامعہ و جماعت

تعطیل رمضان وعید الفطر

جامعہ سلفیہ بنارس میں سال رواں ۲۰۱۰-۱۱ء میں تعطیل رمضان وعید الفطر مورخہ ۷/اگست ۲۰۱۰ء مطابق ۲۵/شعبان ۱۴۳۱ھ بروز سنیچر تا ۱۷/ستمبر ۲۰۱۰ء مطابق ۷/شوال ۱۴۳۱ھ بروز جمعہ رہے گی۔ (ادارہ)

انجمن حفلۃ الخطابہ جامعہ رحمانیہ کا انتخاب

بحمد للہ مورخہ ۲۹/ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۲/ جولائی ۲۰۱۰ء بروز سوموار انجمن حفلۃ الخطابہ کا انتخاب جدید مولانا نعیم الدین صاحب مدنی /حفظہ اللہ شیخ الجامعہ سلفیہ، واساتذۂ کرام کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ اتفاق رائے سے درج ذیل عہدے داران منتخب ہوئے۔

محمد عاصم افضال احمد	ناظم
کوثر عالم عبدالستار	نائب ناظم اول
ریاض احمد صغیر احمد	نائب ناظم دوم
طارق اسعد اسعد اعظمی	مدیر'المصباح'
شکیل احمد بخر یس احمد	نائب مدیر'المصباح'
محمد نثار محمد یٰسین	امین المکتبہ
زبیر احمد انجم علی	نائب امین المکتبہ

کلیۃ الحدیث الشریف، بنگلور کے زیر اہتمام آل انڈیا مسابقہ: حفظ حدیث

حفظ حدیث کا آل انڈیا مقابلہ بروز منگل ۱۴/ستمبر ۲۰۱۰ء صبح ۸ بجے منعقد ہوگا۔ امتحان تقریری وتحریری دونوں طرح کا ہوگا۔ مسابقہ صحیح البخاری کے کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ میں ہوگا، جس میں اس کتاب کی جملہ احادیث کا حفظ، ترجمہ ومختصر تشریح اور راوی حدیث کا تعارف مطلوب رہے گا۔

مقابلہ میں شرکت کرنے والے تمام طلباء انعامات سے نوازے جائیں گے نیز مسابقہ میں شرکت کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے کسی معروف ادارے سے سند یافتہ ہو (بشرطیکہ فراغت پر دوسال سے زیادہ کا عرصہ نہ گذرا ہو) یا فضیلت (اول، ثانی) میں زیر تعلیم ہو اور اس سلسلے میں مطلوبہ اوراق (سند فراغت یا ادارے کا تصدیق نامہ) اپنے ساتھ لائے۔

مسابقہ میں شرکت کی رغبت رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ بروز ہفتہ ۱۰/ رمضان ۱۴۳۱ھ کی شام تک بذریعہ فون اس نمبر (09686553426) پر رابطہ کر کے اپنے نام درج کروائیں۔ خیال رہے کہ محدود تعداد کی ہی گنجائش ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے اس نمبر پر رابطہ کریں۔ (09972381818) ☆☆☆

باب الفتاوی

سوال: نماز میں صفوں کی درستگی کے بارے میں شریعت کی کیا رہنمائی ہے؟ واضح فرمائیں۔

الجواب بعون اللہ الوہاب ومنہ الصدق والصواب:

صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ نماز باجماعت میں صفوں کی درستی اور صف بندی کی بہت زیادہ اہمیت ہے، صفوں کی درستی اقامت صلاۃ اور تمام صلاۃ میں سے ہے اور صفوں کا ٹیڑھا ہونا نماز کے نقصان کا موجب ہے، چنانچہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے پیارے رسول جناب محمد ﷺ نے فرمایا: "سوّوا صفوفكم فإن تسوية الصفوف من اقامة الصلاة" (صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اقامۃ الصّف من تمام الصلاۃ ح:۷۲۳، صحیح مسلم ح:۴۳۳، ابوداود ح:۶۶۸، ابن ماجہ ح:۹۹۳، مسند احمد:۳/۱۷۷، دارمی:۱/۲۸۹ وغیرہ) یعنی اپنی صفوں کو برابر کرو کیونکہ صفوں کی برابری و درستی نماز قائم کرنے کا حصہ ہے۔

اسی طرح ایک دوسری روایت جو کہ سیدنا حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: " أقيموا الصف في الصلاة فإن اقامة الصف من حسن الصلاة " (صحیح بخاری، کتاب الاذان:۷۲۲، مصنف عبدالرزاق:۲۴۲۴) یعنی نماز میں صف قائم کرو، بے شک صف کا قائم کرنا نماز کے حسن میں سے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "أقيموا الصف وحاذوا بين المناكب وسدوا الخلل ولينوا بأيدي اخوانكم ولا تذروا فرجات للشيطان ومن وصل صفا وصله الله ومن قطع صفا قطعه الله" (صحیح سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف ح:۶۲۰، سنن نسائی، کتاب الامامۃ، باب من وصل صفا ح:۸۱۸) یعنی صفوں کو سیدھا کرو اور کندھوں اور بازوؤں کو برابر کرو، اور شگاف (خلا) کو بند کرو، اور اپنے بھائیوں کے لیے نرم ہو جاؤ، اور شیطان کے لیے (صف میں) خالی جگہ نہ چھوڑو، اور جو شخص صف کو ملائے گا اللہ تعالی اسے ملائے گا اور جو صف کو کاٹے گا اور اللہ تبارک وتعالی اسے (اپنی رحمت سے) کاٹ دے گا۔

امام ذہبی ؒ وامام حاکم ؒ نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور علامہ عصر ناصر الدین البانی ؒ نے بھی اس روایت کو صحیح کہا ہے، دیکھئے: صحیح الترغیب والترھیب (۴۹۲)

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ صف کا صحیح و درست رکھنا نماز کے حسن اور خوبصورتی میں سے ہے، اس کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا ہے، اگر صف کی درستگی میں کمی رہے گی تو نماز کے اندر نقصان لازم آئے گا، واضح رہے کہ یہ عمل صرف رکوع ہی میں نہیں بلکہ قیام ہی سے ضروری ولازمی ہے، آپ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ پہلے صفوں کو درست کرتے تھے پھر نماز شروع کرتے، اگر صف میں نقص ہوتا تو آپ ﷺ اصلاح فرماتے۔

حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکبیر تحریمہ سے پہلے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرماتے: "تراصوا واعتدلوا" (صحیح مسلم ح ۴۳۳، مسند احمد ۳/۲۶۸) یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے مل جاؤ اور برابر ہو جاؤ۔

حضرت نعمان بن بشیر ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صفوں کو درست کرتے تھے حتی کہ اسے نیزے یا تیر کی مانند کر دیتے، ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کا سینہ (صف سے) آگے بڑھا ہوا دیکھا تو فرمایا: ''اپنی صفوں کو درست کرو، ورنہ اللہ تعالی تمہارے چہروں کے درمیان مخالفت ڈال دے گا''، بعض روایات میں چہروں کے بجائے دلوں کا ذکر ہے۔ (صحیح مسلم ح ۴۳۶، کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف واقامتھا .....، صحیح بخاری:۷۱۷ مختصر)

شارح صحیح مسلم امام نووی ؒ اس حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "يوقع بينكم العداوة والبغضاء واختلاف القلوب" (شرح مسلم ۲/۳۹۴) یعنی اللہ تعالی تمہارے درمیان دشمنی، بغض اور دلوں کا اختلاف پیدا کر دے گا۔

اور شارح بخاری حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ عمل واجب ہے''۔(فتح الباری ۲/۴۴۳)

اسی طرح سیدنا براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ ''رسول اکرم ﷺ ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک صفوں میں گھس جاتے، آپ ﷺ ہمارے سینوں اور کندھوں کو چھوتے اور کہتے: ''اختلاف نہ کرو، تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے''، اور کہا کرتے تھے: ''بے شک اللہ عز وجل اور اس کے فرشتے پہلی صفوں پر صلاۃ بھیجتے ہیں۔'' (سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف ح:۶۶۴، سنن نسائی، کتاب الامامۃ، باب کیف یقول الامام الصفوف ۸۱۲)

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ صف کی درستگی نماز شروع کرنے سے پہلے ہونی چاہئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کا کام صفیں درست کرنا بھی ہے، اگر صف میں کہیں خلل ہو تو امام کو چاہئے کہ وہ صحیح کرائیں پھر نماز شروع کریں، ائمہ مساجد اور دیگر مصلیان کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے، اور ہر شخص کو نماز میں اس طرح کھڑا ہونا چاہئے کہ اپنے ساتھ والے کے کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں پورا ملا ہو، درمیان میں کوئی خلا نہ ہو، کیونکہ شریعت میں اس کا تاکیدی حکم موجود ہے، چنانچہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

" لقد رأيت أحدنا يلزق منكبه بمنكب صاحبه وقدمه بقدمه ولو فعلت ذلك بأحدهم اليوم لنفر كأنه بغل شموس"۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ح:۳۵۲۴، فتح الباری ۲/۲۱۱) یعنی میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنا کندھا اپنے ساتھی کے کندھے سے اور اپنا پاؤں اپنے ساتھی کے پاؤں سے چپکا دیتا ہے اور اگر تو آج کسی کے ساتھ ایسا کرے تو ان میں سے ہر کسی کو دیکھے گا کہ وہ (ایسے بدکتا ہے) گویا وہ شریر خچر ہے۔

حضرت ابوعثمان النھدی فرماتے ہیں: "كنت فيمن ضرب عمر بن الخطابؓ قدمه لإقامة الصف في الصلاة"۔ (المحلی لابن حزم ۴/۵۸، فتح الباری ۲/۲۱۰، مصنف ابن ابی شیبۃ ۱/۳۰۹، ح:۳۵۳۰) یعنی میں ان لوگوں میں تھا جنہیں حضرت عمر بن الخطابؓ نے نماز میں صف قائم کرنے کے لیے پاؤں مارا تھا۔

درج بالا صحیح اور حسن احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز شروع کرتے وقت پہلے صفیں سیدھی کرنی چاہئیں، اگر صف میں کوئی خلا ہو تو اسے بند کیا جائے، ہر نمازی اپنے بھائی کے پاؤں سے پاؤں اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں، اور یہ عمل قیام ہی سے ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ قیام میں کندھوں میں اور پاؤں میں وقفہ ہو اور جب رکوع میں جائیں تو ملانا شروع کر دیں، اسی طرح پاؤں کی صرف ایک انگلی نہیں بلکہ پورا قدم ملانا چاہئے جیسے کہ صحابہ کرامؓ ملایا کرتے تھے۔

صف بندی کرتے وقت اسکا بھی خیال رہے کہ پہلے اگلی صف مکمل ہو جائے، اس کے بعد دوسری پھر تیسری صف لگانی چاہئے، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "أتموا الصف المقدم ثم الذي يليه فيما كان من نقص فليكن في الصف المؤخر"۔ (صحیح سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف ح:۶۲۳، ابن خزیمہ:۱۵۴۶) یعنی پہلے اگلی صف کو مکمل کرو پھر اس سے قریبی کو اور جو بھی کمی ہو وہ پچھلی صف میں ہونی چاہئے۔

اسی طرح حضرت جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرشتوں جیسی صف بنانے کی ترغیب دلائی اور پھر فرشتوں کا صف بنانے کا طریقہ بتلایا: "يتمون الصف الأول ويتراصون في الصف" (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الأمر بالسکون فی الصلاۃ ح ۴۳۰، ابن ماجہ:۹۹۲) یعنی وہ (فرشتے) پہلی صف کو مکمل کرتے ہیں اور صف میں خوب مل کر کھڑے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالی تمام مسلمانوں کو صحیح طور پر صف بندی کر کے سنت کے مطابق نماز ادا کرنے کی توفیق دے، آمین۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواف

ابوعفان نور الہدی عین الحق سلفی مالدہی

استاذ جامعہ سلفیہ بنارس